تعلیماتِ اسلام کا علمبردار دینی و علمی ماہنامہ
الحق
سرپرست
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق مدظلہ
دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور، پاکستان

مقاصد

علوم اسلام کی ترویج، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد، عصر حاضر کے فکری و نظری فتنوں کی سرکوبی، حق کا دفاع، اصلاح معاشرہ و معروفات کا فروغ، منکرات پر تنقید، ملت کو درپیش علمی ... معاشرتی اور معاشی مسائل میں کتاب و سنت کی ترجمانی، تحقیقی مقالات فقہی و علمی مضامین، عالم اسلام کے حالات، فتنۂ مغربیت کا تعاقب، پرمغز اداریے، تبصرہ کتب، معیاری ... دارالعلوم حقانیہ کی ترجمانی، سیاست اسلامی اور حکومت الٰہیہ کا منادی، ملک و بیرون ملک مسلمانوں کے ہر طبقہ میں مقبول، ہر شمارہ عالم اسلام کے چیدہ اور جید اصحاب علم و فضل کی فکری کاوشوں کا حسین مرقع ... کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ بہترین، ٹائیٹل سالانہ چندہ ۱۲ روپے غیر ممالک ہوائی ڈاک سے تین پونڈ بحری ڈاک سے دو پونڈ۔

الحق کو دنیائے علم و صحافت کا خراج تحسین

چند خطوط۔ تحریری تاثرات سے اقتباسات

الجمعیۃ دہلی۔ علمی جواہر پاروں سے آراستہ۔ تسکین حیات اعلاء گیر جذبہ کی متحرک تصویر (مولانا محمد میاں دہلوی) ماہنامہ ... دیوبند پاکستانی جرائد میں "الحق" کو ایک نیا اور خاص مقام دار ہر شاہ قیصر، ماہنامہ برہان دہلی مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ علمی بھی ... جدیدہ کے فکری فتنوں پر تنقید بھی، ادبی چاشنی بھی۔ صدق جدید لکھنؤ عبدالماجد دریابادی: مذہبی علمی، دلچسپ، شگفتہ ... معلومات۔ پھر خشک اور زاہدانہ بھی نہیں، الحق کو تجربہ کے لیے کھولا تو دل لگ گیا۔ الفرقان لکھنؤ۔ الحق نے اس راہ کے تجربہ کاروں کو مات کر دیا۔ روزنامہ جنگ پاکستان۔ الحق عالم با عمل بنانے میں معاون ... شہاب لاہور (مولانا کوثر نیازی) جدید مسائل پر دور حاضر کے متبحر علماء کے تبرکات اور ظاہری دلآویزی بھی۔ فاران کراچی۔ متجددین مغرب زدوں کے افکار باطل کی تردید (ماہر القادری)۔ فردا تہران ایران۔ الحق ہم ... موضوعاتی از زندہ در علوم اسلام۔ ماہنامہ وحید تہران۔ ... مجلہ ہائے معتبر و مفید پاکستان، مادی مطالب سودمند۔ امروز لاہور اس قدر شگفتہ اور شستہ زبان کہ ملک کے چوٹی کے دینی رسالوں میں شمار ہو ... تحقیقات میں محنت ظاہری و باطنی خوبیوں کا مرقع۔ قاری محمد طیب دیوبند (ایک اداریہ کے بارہ میں) انشاء و ادب بھی ماشاء اللہ زبان اور سلاست بیان بھی قابل قدر اور لائق صد تحسین (یہ اداریہ میرے ... ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ۔ الحق دیکھنے سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مرض کی صحیح تشخیص کرلی ہے، ندوۃ العلماء کے اساتذہ و طلبہ استفادہ کرتے رہتے ہیں، خصوصاً اداریے بہت ہی جاندار ... ہر دل عزیز کا صحیح مصداق ہیں۔ مولانا محمد میاں دہلوی۔ موصوف شاندار ماضی، اقلام حق فریضہ مسلم ہے طبیعت چاہتی ہے کہ الحق کی بھی کچھ خدمت کروں۔ مولانا ابوالوفاء افغانی حیدرآباد دکن۔ ماشاء اللہ بہت ... مولانا زکریا شیخ الحدیث سہارنپوری۔ دارالعلوم اور ماہنامہ الحق کے لیے ہر نوع ترقیات سے نوازنے کا دعا گو ہوں۔ مفتی محمد شفیع دیوبندی۔ الحق وقت کی ضرورت۔ مولانا عبداللہ درخواستی۔ الحق نام ... پر چلنے اور بہت کی دعا کرتا ہوں۔ مولانا عبیداللہ انور۔ الحق ہندوستان کے معارف اور برہان کی کمی کو پورا کر دے گا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی۔ الحاد، تحریف، تجدد کے خلاف مضامین الحق میں بھیجا کروں گا۔ علامہ محمد یوسف بنوری۔ اداریہ پڑھ کر دل سے دعا نکلی بے حد مسرت ہوئی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ علامہ شمس الحق افغانی معیاری پرچہ کے اصول پر پورا اور معیاری حیثیت کی راہ پر گامزن۔ مولانا محمد ... مضامین کو گنجینہ خصوصاً نقش آغاز بار بار اور غور سے پڑھنے کا۔ زیڈ اے سلہری۔ اسے ۳ کا خزینہ سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر حمید اللہ پیرس۔ الحق بھیجنے کا ممنون ہوں۔ نعیم صدیقی۔ ٹھوس علمی سرمایہ اور گرد کے فتن ... کا ذخیرہ قابل استفادہ رسائل میں بطور خاص شامل۔ پروفیسر حسن عسکری۔ دین کی مدافعت کا کام انصاف و اعتدال کے ساتھ اس کے برابر کوئی اور رسالہ نہیں پہنچ سکتا، حق بات کے بے خوف اداریے۔ حکیم محمد ... اسلام کے مختلف پہلوؤں تعلیم سیاست تاریخ قرآن و حدیث کا جامع۔ انعام اللہ خان موتمر عالم اسلامی۔ الحق مسلمانوں اور عالم اسلام کی بڑی خدمت کر رہا ہے موثر کامیابی کی دعا۔ قاضی عبدالصمد سربازی ... منصوبے کا عملی جامہ ہر طبقہ کے لیے مفید اور کار آمد۔ حفیظ جالندھری۔ الحق میں بہت کچھ ان مسائل کے بارہ میں موجود ہے جو ہم سب کو طبقہ وار ورغلانے والوں کو درپیش ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لاہور۔ ... میں، آپ نے آثار کا بہت عمدہ مجموعہ فراہم کر لیا جو آگے چل کر دینی مقاصد کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

○ ماہنامہ الحق ○ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور پاکستان

اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کی مصدقہ اشاعت

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم — ۷

فون نمبر رہائش — ۲

مدیر: سمیع الحق

اپریل ۷۷ء

بدل اشتراک

پاکستان میں سالانہ ۱۵/ روپے۔ فی پرچہ ایک روپیہ ۵۰ پیسے
بیرونِ ملک بحری ڈاک ایک پونڈ، ہوائی ڈاک دو پونڈ

جلد نمبر ۱۲

شمارہ نمبر ۷، ۸

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہری پور سنٹرل جیل سے ایک خط

از شفیق فاروقی

—— آج ہری پور سنٹرل جیل میں جناب ایڈیٹر الحق کے ساتھ گرفتار ہوتے ہمارا باونؔ ۵۲ واں دن ہے۔ قارئین الحق نے گذشتہ پرچہ کے نقش آغاز کے صفحہ پہ مولانا کی گرفتاری کے نتیجہ میں نقش آغاز سے محرومی کا بڑی شدت سے احساس کیا ہوگا۔ اس دفعہ بھی میں نے بہت کہا کہ آپ جیل ہی سے نقش آغاز لکھ کر بھیج دیجئے مگر وہ اپنی طبیعت آمادہ نہ کر سکے۔ اور کہا کہ ایک تو سنسرشپ کی ظالم تلوار نے قلم کی آزادی ہی نہیں چھینی بلکہ اُسے قتل کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے حالات میں کون وقت ضائع کرے۔ دوسری بات یہ کہ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں اور تحریک کی رفتار اپنی منزلِ مقصود کیطرف اتنی تیز ہے کہ ہر صبح اور ہر شام احساسات اور جذبات کے نئے نئے موڑ سامنے آرہے ہیں۔ ایسے حالات میں کون سے نقطہ پہ جم کر اظہار خیال کیا جائے۔ اس بنا پر میں نے چاہا کہ الحق کے پیارے قارئین سے اس خط کے ذریعہ مخاطب ہو کر کچھ نہ کچھ باتیں کی جائیں اور ہری پور کی وہ اسارت گاہ جو آج تحریک نظام شریعت کے طفیل حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ اور دیگر علماء و مشائخ، اہل علم و قلم ارباب زہد و تقویٰ، زعماء ملک و ملت سیاستدان اور وکلاء اور سیاسی پارٹیوں کے جان نثار لیڈروں اور ورکروں کا ایک عظیم الشان کیمپ بنی ہوئی ہے قارئین کو بھی اسکی کچھ جھلکیاں دکھا دی جائیں۔ ہمارے بہت سے قارئین جو پچھلے کئی ماہ سے الحق کی اشاعت میں بے قاعدگیوں سے اکتا چکے ہیں اور نقش آغاز سمیت اسکے کئی سلسلوں کے ٹوٹ جانے سے شکوے شکایات کر رہے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ گذشتہ، جنوری سے لیکر اب تک الحق کے ایڈیٹر اور اس کا برائے نام سٹاف جو ایک دو افراد سے عبارت ہے، کتنے ہنگامی اور بحرانی حالات سے دوچار رہا۔ ایسے حالات میں پرچہ کا زندہ رہنا بھی قارئین کی دعاؤں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ ادارۂ الحق کسی معیاری کاتب کو معقول تنخواہ پہ ملازم رکھنے سے قاصر ہے اس لئے اکوڑہ سے دور نوشہرہ میں رہائش پذیر ایک جزوقتی کتابت کا کام کرنے والے کاتب کی رہائش گاہ کے چکر مہینہ میں کئی بار کاٹنے پڑتے ہیں کہ الحق کی کتابت مکمل ہو سکے۔ دوسری طرف جناب ایڈیٹر الحق جو دارالعلوم حقانیہ کے انتظامی امور کے علاوہ تدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ علاقہ کے بیشمار مسائل اور پھر مہمانوں کی ہروقت آمدورفت اور اسفار وغیرہ گوناگوں مصروفیات میں گھرے رہتے ہیں اور اسی بھاگ دوڑ میں بعض

اوقات ایڈیٹر صاحب اپنے سفر کے دوران ایک ایک اور آدھے آدھے صفحہ کا مسودہ لکھ کر کاتب کے نام سپرد ڈاک کر دیتے ہیں کہ کسی طرح کتابت کا سلسلہ قائم رہے اور الحق کی اشاعت میں تاخیر نہ ہو۔ کتابت شدہ مضامین کی پروف ریڈنگ زیادہ تر سفر کے دوران ہی کرتے ہیں۔

کتابت کے دشوار گذار مراحل سے گذرنے کے بعد طباعت کیلئے پرچہ اکوڑہ خٹک سے ۵۰ کلومیٹر دور پشاور میں واقع ایک پریس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جہاں طباعت اور بائنڈنگ پر ہفتہ عشرہ سے زیادہ لگ جاتا ہے۔ اس طرح وقت کے ضیاع کے ساتھ ساتھ قارئین کا انتظار بھی شدید ہونے لگتا ہے اور شکایتی خطوط کی یومیہ شرح بڑھتی جاتی ہے مگر قارئین کے خطوط کی تلخی ہمارے حوصلوں کو مہمیز کا کام دیتی ہے، کیونکہ ان کا غصہ درحقیقت ان کی محبت اور الحق کے ساتھ دلی لگاؤ کی دلیل ہے۔

پرچہ پریس کے جانگسل ادوار سے نکل کر اکوڑہ خٹک اپنے دفتر پہنچتا ہے جہاں کوئی اتنا بڑا ڈاکخانہ نہیں جس کا سٹاف ہزاروں کی تعداد میں بھیجنے والے پرچہ کو ایک دن میں نمٹا سکے۔ اس وجہ سے الحق سے بھرے ہوئے ڈاک کے بیگ کئی کئی دن نکلتے رہتے ہیں یا پھر ادارہ اپنے طور انتظامات کے تحت ڈاکخانہ کا ہاتھ بٹاتا ہے تاکہ ایک ہی دن میں ترسیل ہو بہرحال ایسی کئی ایک مشکلات جنہیں ایڈیٹر صاحب اور ادارہ حل کرنے میں کوشاں ہیں کی وجہ سے پرچہ کی اشاعت میں تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔ بلاشبہ ایسے نامساعد احوال میں کہ پرچہ کے وسائل تو کیا محدود سے محدود وسائل بھی نہ ہوں نہ رجال کار ہوں اور نہ ماحول ہو کسی ایسے پرچے کا بارہ سال تک زندہ رہنا بھی اور اسی سج دھج کیساتھ جو روز اول سے تھا کہ اس کا معیار بھی نہ گرنے پایا، محض خداوند کریم کے بے پناہ فضل و کرم کی دستگیری اور اس کے چلانے والے کے نہ ختم ہونے والے جذبہ جہد و عمل کا نتیجہ ہے ورنہ کتنے لوگ ہیں کہ دو چار سال ہی میں حالات کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہیں۔

الغرض یہ تو بعض ایسی مشکلات تھیں جو اکثر الحق کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں، مگر گذشتہ پانچ چھ ماہ تو جس شوراشوری میں گذرے اس میں الحق کی اشاعت میں تاخیر پر جناب ایڈیٹر صاحب اور ادارہ سے شکوہ کرنا بھی ظلم ہے۔

جنوری کی پہلی دہائی میں وزیر اعظم بھٹو نے قومی اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کا اعلان کر دیا تو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ جنہوں نے دارالعلوم کے تدریسی، علمی اور اپنی روحانی مصروفیات کے ساتھ ضعف اور طویل امراض اور پھر مخصوص طبیعت کی بنا پر اسمبلی کی رکنیت کا کوئی لمحہ بھی طیب خاطر سے نہیں گوارا کیا۔ اور پچھلی مرتبہ سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخاب کیلئے بھی بڑی مشکل سے اکابر جمعیۃ العلماء اسلام اور عامۃ المسلمین نے بے حد اصرار

پر انہیں آمادہ کیا تھا، اب اسمبلی کے ٹوٹنے کے اعلان سے انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی، مگر ادھر آپ پنڈی سے اکوڑہ خٹک تشریف لائے ادھر چند ہی دن میں پاکستان قومی اتحاد اپنے اجلاس پشاور میں جس سیٹ پر سب سے پہلے متفق ہوا وہ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ ہی کی سیٹ تھی۔ اسی وقت حضرت مولانا مدظلہ نے حضرت مفتی صاحب اور دیگر حضرات سے باصرار اپنی معذرت پیش کی، مگر جتنا اصرار بڑھتا گیا اتنا ہی ان حضرات نے اپنے فیصلہ کو حتمی اور ناقابل واپسی ہونے پر اصرار کیا پھر حضرت شیخ الحدیث نے اپنے حلقۂ انتخاب کے مخلصین احباب کو جمع کیا۔ ان کے سامنے بھی یہی صورت پیش آئی، آپ حلفاً اپنی مجبوریاں پیش کرتے رہے اور ادھر سے اصرار بڑھتا رہا ادھر بعض لوگوں نے مولانا مدظلہ کے ضعف اور معذرت کو دیکھ کر جناب ایڈیٹر صاحب کا نام پیش کیا مگر وہ اپنے لئے بھی اور حضرت مولانا مدظلہ کے لئے بھی اس انتخابی سیاست میں مزید الجھ جانے کو پسند نہیں کرتے تھے کہ دونوں صورتوں میں انتخابی سیاست کی خار دار جھاڑیوں سے الجھنا اور اسے عبور کرنے کا مشکل کام ایڈیٹر صاحب ہی کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنے تعلیمی، تدریسی اور تصنیف و تالیف اور صحافت کے مشاغل کو انتخابی ہنگاموں اور سیاسی جھمیلوں پر ترجیح دینا چاہتے ہیں۔ لیکن وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی تاریخ سے ایک رات قبل جمعیۃ کے بعض اکابر نے آکر انتہائی عجز و الحاح سے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو کاغذات داخل کرنے پر مجبور کر دیا کہ اسمبلی میں آپ کے بابرکت وجود سے نفس موجودگی بھی خیر و برکت کا باعث ہوگی اور کسی مسئلہ میں اسلام کے لئے آپ کا ہاتھ اٹھانا بھی کافی ہوگا۔۔۔ مقابلہ میں اس وقت کے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اور حکمران پارٹی کے صوبائی صدر جناب نصر اللہ خان خٹک تھے، جو ۱۹۷۰ء میں بھی مولانا مدظلہ سے ہار چکے تھے اور اب جیسا کہ معلوم ہوا ہے وہ اپنے چیئرمین بھٹو صاحب سے مجبور تھے اور اضطراراً انہوں نے حضرت شیخ الحدیث سے مقابلہ کے مرگ مفاجات کو قبول کیا۔ اس وقت حکمران پارٹی بظاہر اپنے عروج کے انتہا پر تھی، بھٹو صاحب خود بھی بلا مقابلہ آئے اور ان کے چاروں وزراء اعلیٰ کے لئے بھی یہی پالیسی طے ہوئی کہ پارٹی کے کسی وزیر اعلیٰ کی شکست کی صورت میں حکمران پارٹی کی ساکھ کو بین الاقوامی طور پر نقصان پہنچتا ہے۔ بہرصورت حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے تو کاغذات داخل کر دیئے، آگے انتخابی معرکہ کارزار کو سر کرنا اور اس کی دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کرنے کا کام تو چار و ناچار مولانا سمیع الحق صاحب کے گلے پڑنا تھا، مرتا کیا نہ کرتا، اب وہ کمر ہمت باندھ کر اتنی ہی شدت سے انتخابی معرکوں میں کود پڑے جس شدت سے حریف سے مقابلہ تھا، حریف ہر طرح سے اسلحہ سے لیس تھا، صوبائی حکومت کا سربراہ اور مرکزی حکومت کا نمائندہ ہی نہیں بلکہ چہیتا، لاکھوں کے فنڈ اور سرکاری وسائل ان کے پاس اور اس بیدردی سے حریف نے ان وسائل سے فائدہ اٹھایا کہ اخبار نوائے وقت (۱۹ر فروری) کے بقول حلقہ انتخاب

کے کسی ایک چھوٹے سے قصبہ کے جلسہ کیلئے ایک سو بیس ٹرک پکڑے گئے۔ سرکاری محکموں کی جیپ اور گاڑیاں الگ مخالفت میں شب و روز دوڑ رہی ہیں، ادھر انتظامیہ۔ اے سی اور ڈی سی، آئی جی سے لے کر کمشنر اور گورنر تک حریف کی کامیابی میں حیران و سرگرداں (مولانا مدظلہ کے جعلی واپسی کے کاغذات داخل کرنے اور بھگتانے میں بھی ان سب لوگوں نے حریف کے لئے آلہ کار ہونے کا فریضہ انجام دیا۔) حریف امیدوار نے پشاور کا وزیر اعلیٰ ہاؤس چھوڑ کر نوشہرہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ کئی ٹیلیفون لائنیں لگ گئیں۔ پولیس کے بڑے بڑے افسر تحصیل نوشہرہ کے مفلوک الحال اور پسماندہ بستیوں میں جا جا کر غریب لوگوں کو دھونس سے وزیر اعلیٰ صاحب کو کامیاب کرنے کے احکام نافذ کرتے خود وزیر اعلیٰ صاحب انتخابی مہم میں جہاں بھی جاتے ہسپتالوں، سڑکوں، سکولوں، آبنوشی، بجلی، صحت تعلیم کے منصوبوں کے ہوائی طومار باندھتے، ان دنوں مشہور تھا کہ وزیر اعلیٰ صاحب گاڑی میں اپنے ساتھ فیتہ اور چونا بھی رکھتے ہیں، اور جہاں کسی گاؤں میں لوگوں کا مطالبہ سنا یا کسی ضرورت کا احساس ہوا تو وہیں فیتہ سے کوئی زمین ناپ کر چونے سے نشان لگوا لیتے کہ یہی سکول اور ہسپتال ہے، بس صرف بننے کی دیر ہے۔ اس ضمن میں وزیر اعلیٰ صاحب نے پبی کے نواحی دیہات کے ایک دن کے دورے میں جن منصوبوں اور ترقیاتی سکیموں کا دیہاتی باشندوں کے سامنے اعلان کیا ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کیلئے کم از کم دس کروڑ روپے درکار تھے، یہ نہ ہو سکتا تھا نہ ان وعدوں کے پیچھے تکمیل کا کوئی داعیہ تھا، مگر دیہاتی باشندوں کو کسی طرح مولانا مدظلہ سے کاٹ کر ووٹ حاصل کرنے کی ہر وہ سعی جو حریف امیدوار کر سکتا تھا اس نے اس میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ بہر حال ایسے حریف سے مولانا سمیع الحق صاحب جو ساری انتخابی مہم کے انچارج تھے کو تحصیل کے مخلص بے لوث ورکروں رضاکاروں اور حضرت مدظلہ کے فدائیوں سے نمٹنا پڑا جب کہ خود مولانا کے پاس ایک دو ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں کے علاوہ ایک جیپ تک نہیں تھی۔ اور یہ تو بعد کی باتیں ہیں —— کاغذات نامزدگی سے لیکر کاغذات کی واپسی ۲۹ جنوری تک وہ کیا کچھ تھا جو حریف نے حضرت مدظلہ کو راستہ سے ہٹا کر خود بلا مقابلہ منتخب ہو جانے کیلئے نہ کیا۔ حضرت مدظلہ تو علالت کی وجہ سے گھر ہی میں رہے اور ان لوگوں سے بالکل پس پردہ جن کی ذات بابرکات وزیر اعلیٰ اور اس کے حواریوں کی رسائی بھی نہ ہو سکی مگر ان دنوں تحریص و ترغیب اور ڈرانے دھمکانے کی کوئی ایسی صورت نہ تھی جس سے براہ راست مدیر صاحب کو گذرنا نہ پڑا ہو، عموماً یہ حملے رات کو ہوتے تھے اور دن کو بھی تعاقب جاری رہتا تھا —— مرکز میں وزارت، سینٹ کی ممبری، صوبائی ممبری، دار العلوم کو موجودہ معیار سے دس گنا ترقی دینے کے نام سے "اسلام کی دردمندی" کے لبادہ میں طول طویل رقومات کی پیشکش، علی ہذا القیاس۔ مگر ایڈیٹر صاحب ایجنٹوں کی کوئی بات سنے بغیر ہی ایک خندہ استہزاء سے ان کے ظرف اور ذہنیت کے پرخچے اڑا دیتے اور کہتے کہ اللہ کے بندو مسئلہ کسی ایک سیٹ کا نہیں یہ تو شاہ ولی اللہ سید شہیدؒ اور شیخ الہندؒ کی تحریک ہے،

مجدد الف ثانی کا دیا ہوا درس ہے، اسکی کوئی قیمت دنیائے حقیر کی منڈی میں لگائی ہی نہیں جا سکتی۔ پھر دھمکیوں پہ بات آجاتی یعنی دارالعلوم کو اصطبل بنانے (نعوذ باللہ) اور قتل وقتال کے امکانات، مگر آپ کہتے کہ کوئی بات نہیں اب تو حضرت شیخ الحدیث کے گھر کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد اور سب سے چھوٹا بچہ راشد (مدیر الحق کے فرزند) بھی اس راہ میں لگ جائیں تو زہے نصیب۔ پھر جرگوں کی بات ہوتی کہ ہم ملک کے معزز ترین افراد بشمول چیئرمین بھٹو صاحب کا جرگہ مولانا کے سامنے لائیں اور مولانا مدظلہ دستبردار ہو جائیں۔ یہ سب حربے ناکام ہوئے اور حریف ہر لحاظ سے اپنے آپ کو مقابلہ کے میدان میں ہارنے لگا۔ تو ۲۸ جنوری کو بعجلت تمام نہایت ناقص منصوبہ کے ساتھ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف سے "وزیر اعلیٰ صاحب" کے حق میں دستبردار ہونے کے کاغذات داخل کرادئے، ریٹرننگ آفیسر اے سی صاحب نوشہرہ بھی ان کے چشم وابرو کے اشارہ پہ چلنے والے وکیل بھی اور گواہ بھی ان کے انتخابی ورکر خود ہی منصف خود ہی گواہ۔ ۲۹ جنوری کو صبح سویرے فون کی گھنٹی بجی، ایڈیٹر صاحب نے ریسیور اٹھایا۔ پنڈی سے ایک جان نثار چیخ رہا تھا کہ اخبارات اور ریڈیو سے مولانا مدظلہ کی دستبرداری کا اعلان کیسے ہوا۔ یہ اس دن کے اخبارات کی ہیڈ لائن تھی اور ایسی سرخیوں کو پشاور ریڈیو نے صبح صبح نشر کر دیا تھا۔ یہ اطلاع ایک بم سے کم نہ تھی دشمن نے ہر طرح ناکامی دیکھ کر دجل و فریب کی آڑ لی تھی اور اس کا نشانہ بھی اب حضرت مولانا مدظلہ سے زیادہ بے چارے ایڈیٹر الحق ہی بننے والے تھے، خیالات اور دلوں کی دنیا پر کسی کا پہرہ ہوتا نہیں، اب جتنے منہ اتنی باتیں اور باتیں نہ سہی تو دل و دماغ تو ہر طرح کے خیالات کو ہضم کر سکتے ہیں۔ مگر ایڈیٹر صاحب نے اللہ کا نام لیکر لحاف دور پھینک دیا اور اس شدت سے آخر تک اس دجل و فریب کا دو ہفتے تک دن رات ایک کر کے مسلسل تعاقب کیا کہ جب تک اسلام آباد کے الیکشن کمیشن کے آڈیٹوریم ہال میں اس پرفریب جعلسازی کے پرخچے نہیں اڑے اس وقت تک دم نہ لیا۔ اسی دن حضرت مفتی محمود صاحب پشاور میں تھے، یہ خبر سنتے ہی صبح صبح نوشہرہ پہنچے حضرت شیخ الحدیث نے فوراً تردیدی بیان جاری کیا، مجمع میں تردیدی تقریر کی، حضرت مفتی صاحب نے پشاور میں پریس کانفرنس بھی کی، مدیر صاحب نے اسی دن وزیر اعظم اور الیکشن کمشنر کو تار دئے۔ الیکشن کمشنر سجاد صاحب سے فون پر حضرت مفتی صاحب نے بات کی یہ سب تفصیلات اخبارات اور رسائل میں آتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ مولانا مدظلہ کیساتھ اس فریب کاری کی گونج بی بی سی اور وائس آف امریکہ، ریڈیو جرمنی سے بھی سنائی دی ـــــ۔

کیس چیف الیکشن کمشنر کے پاس گیا، نہایت مختصر وقت میں کیس کی دستاویزی تیاری اور ۵ - ۵ فائل مکمل کرانے کا چیف صاحب نے دوسرے دن تک داخل کرانے کا حکم صادر کیا اور اب ایڈیٹر صاحب کو ایک نئے تجربہ (عدالت، کچہری، وکلاء وغیرہ) سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو ایک دوست کی جگہ ٹھہرا کر آپ نے ۲۴ گھنٹے میں کیس کی تیاری کا معرکہ بھی سر کر لیا۔ دوسرے دن ۴ بجے تک کئی سو بیانات حلفی فوٹوسٹیٹ اخبارات کے تراشے اور مدلل دعویٰ بنام وزیر اعلیٰ کے فائل تیار ہو گئے خدا نے بھی ہر طرح مدد فرمائی ایڈیٹر صاحب نے احتیاطاً

اسے کے بروہی صاحب (جو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے دل وجان سے معتقدین میں سے ہیں۔) سے بھی کراچی فون پر بات کی، انہوں نے فرمایا کہ میں کل راولپنڈی میں ہوں گا، انٹر کانٹیننٹل میں ملئے، دوسرے دن انہوں نے حالات سنے تو حضرت کے تعلق کی وجہ سے آبدیدہ ہوگئے اور ایڈیٹر صاحب کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل کے اوپر کافی دیر تک لگائے رکھا۔ حاضرین مجلس سے کہہ رہے تھے کہ دیکھئے کیسے کیسے لوگ ان حالات کا شکار ہوگئے۔ اب اور دل کی کیا بات کی جائے۔ پھر مدیر صاحب سے کہا کہ اس کیس کا یہاں عدل وانصاف کے مطابق فیصلہ نہ ہوا تو میں اسے خود آگے عدالت میں لیکر جاؤں گا۔ اور مولانا مدظلہ سے کہئے کہ "آپ کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر پورا اختیار دیا ہے اگر ضرورت سمجھیں تو جب چاہیں بلائیں۔ مجھے حکم دیں میں آجاؤں گا۔" ۔۔۔۸ الیکشن کمیشن میں پیش ہوا۔ جناب سجاد احمد جان چیف الیکشن کمشنر عبدالحفیظ میمن جسٹس سعد سعود جان پر مشتمل کمیشن کے سامنے حضرت شیخ الحدیث پیش ہوئے، ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اہم ترین عدالت میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے اپنے اساتذہ حضرة مدنیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ جیسے بزرگوں کی سنتوں کی تعمیل کروائی کہ عمر کے آخری ادوار میں عدالتوں کے مراحل سے بھی دین کے لئے گذریں۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کو حق تعالیٰ نے اولیاء اللہ کی جن ظاہری انوار و علامات سے بھی نوازا ہے اور خدائی ہیبت وہ یہاں بھی کام آئی جناب چیف الیکشن کمشنر نے سماعت شروع ہونے سے قبل نہایت ادب واحترام سے مولانا مدظلہ کو مخاطب کیا اور فرمایا آپ کرسی پر آرام سے تشریف رکھ کر کارروائی میں حصہ لیں کارروائی شروع ہوئی جو ساڑھے چار گھنٹے تک جاری رہی، مولانا مدظلہ کے وکیل جناب بشیر احمد انصاری تھے اور اعزازی طور پر جناب سینیٹر اور بیرسٹر ظہور الحق بار ایٹ لاء اور دیگر وکلاء بھی آخر تک موجود رہے، مخالف فریق اپنے طور پر اعلیٰ سے اعلیٰ وکلاء کو لاچکے تھے، یہاں حق وصداقت ایسا نمایاں رہا کہ الیکشن کمیشن کے سربراہ سمیت دیگر ارکان خود مولانا مدظلہ کے گویا وکیل بن گئے مخالف فریق کے بے سروپا جرحوں کا خود چیف صاحب نوٹس لیتے رہے اور ڈانٹتے رہے پھر خود حضرت شیخ الحدیث نے جس سادے اور مؤثر مختصر جوابات دئے اس سے بھرے ہوئے ہال میں داد وتحسین کی آوازیں گونجنے لگ جاتیں اس کارروائی کا کچھ نہ کچھ حصہ اخبارات میں شائع ہوا تو کمیشن کے فیصلہ دینے سے قبل بھی جس نے اسے پڑھا اس نے یہی کہا کہ اب رسمی اعلان باقی ہے۔ مولانا مدظلہ کو خدا نے اس کیس میں فتح دی، حق واضح ہوگیا۔ آگے فیصلہ جو بھی ہوا کہ چیف الیکشن کمشنر نے ایک اہم پریس کانفرنس بلا کر اس مقدمہ میں مولانا مدظلہ کو حق بجانب قرار دینے کا اعلان کیا اور مولانا کے نام پر واپسی کے کاغذات کو جعلی اور غیر قانونی قرار دیا اور وزیر اعلیٰ صاحب کو بادل نخواستہ ایک ایسی شخصیت کے ساتھ مقابلہ پر مجبور ہونا پڑا جو خود الیکشن کے دوران اپنی دینی بے احتیاطی، کم علمی یا جذبات میں مغلوب ہوکر بیشمار لوگوں کے سامنے یہ کہتے پھرتے رہے کہ میں کیسے مقابلہ کروں اور جیئوں جبکہ "نعوذ باللہ" میرے مقابلہ میں تو پیغمبر کھڑا ہوگیا ہے ۔۔۔ چیف الیکشن کمشنر کیطرف سے شیخ الحدیث مدظلہ،

باقی صفحہ ۵۹ پر

فکرِ آخرت

موت ومابعد الموت

(خطبۂ جمعۃ المبارک ـــــــ ضبط و ترتیب : ادارۃ الحق)

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کے دو وجوہ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی نماز نہ پڑھے زکوٰۃ نہ دے اپنی زندگی اپنی معاشرت شریعت کے مطابق نہ گذارے تو یا تو اس میں کفر ہے، اندر سے، یا وہ بہت احمق اور بے وقوف ہے اور بہت لوگ زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر اندر سے ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔

ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الآخر وماھم بمومنین۔

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ زبان سے تو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ مؤمن نہیں ہیں۔

عقیدۂ آخرت بھائیو! ایمان تب آئے گا کہ یہ عقیدہ اور یقین ہو ہمارا کہ میرے ہر عمل اور بدعملی کا حساب ہوگا۔ اور قیامت کا دن حق ہے، میری ذرہ ذرہ نیکی اور بدی میرے سامنے آئے گی اور خدا کے سامنے حساب دینا ہوگا، صرف نماز روزہ کا نہیں بلکہ ہر چیز کا۔ مال کا کہ کیسے کمایا اور کیسے خرچ کیا۔؟ کس کس جگہ صرف ہوا، ہر اقدام کا پوچھا جائے گا کہ سے کس عمل کا ذریعہ بنایا ہاتھ سے دماغ سے کان سے دل سے کہ انہیں کن مواقع میں صرف کیا۔

ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

کان، آنکھ، دل ہر چیز کے بارہ میں باز پرس کی جائے گی۔

خدا کے سامنے ہر عضو کی کارگذاری پیش ہوگی۔ آنکھوں کے دیکھنے کا حساب ہوگا۔ کہ نظر بد کیا یا اچھا، زبان کہاں کہاں استعمال کی۔؟

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس

بیشک ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم اس کے

بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔
دل میں گذرنے والے وسوسوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم اسے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

یہ سب کچھ خدا کو معلوم ہے۔ اگر ایک جگہ نگاہ ڈالنی جائز نہ تھی آپ نے نظریں نیچی کیں تو خدا اس کا اجر و ثواب دے گا۔ ایمان کی روشنی اور نور دل میں پیدا ہوگا۔

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کے بہت بڑے عالم مصلح اور مبلغ گذرے ہیں ایک مرید کا قصہ نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص بڑے ذاکر و عابد تھے۔ راستہ میں جا رہے تھے اُس زمانہ میں ہندو اور سکھ بھی تھے، ایک سکھ عورت تالاب میں نہا رہی تھی کہ اس شخص کی نگاہ پڑ گئی اور کھڑے ہو گئے۔ تو خدا نے اس سے سب کچھ چھین لیا۔ سب کچھ اس کا غرق ہو گیا تو خدا غیور ہے۔ وہ اپنے بندہ کے بارہ میں برداشت نہیں کرتا کہ وہ خالق اور مخلوق دونوں سے محبت رکھے۔

نافرمانی کے دو اسباب امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ کہ جو مرد اور عورت دیندار نہیں یا تو اس میں کفر ہے یا اسے خدا کے محاسبہ اور حساب و کتاب کا خطرہ نہیں ورنہ اگر اسے یقین ہوتا کہ ذرّہ ذرّہ کا حساب دینا ہے۔ تو پھر کون اتنا جری اور بہادر ہو سکتا ہے کہ خدا کی نافرمانی کرے۔

عقیدہ کا پہلا سبق مسلمان کو یہ دیا جاتا ہے کہ :

آمنت باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔
ایمان لایا میں اللہ تعالیٰ پر اس کے ملائکہ پر اور اسکی کتابوں اور رسولوں پر اور قیامت کے دن اور اس بات پر کہ خیر و شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے، اور مرنے کے بعد اٹھنے پر۔

آخرت کا عقیدہ ہو تو مسلمان ٹھیک ہوگا۔ اسلام پر عامل ہوگا وہ اندھیری رات میں ہو جنگل میں بھی برہنہ ہو بھوکا پیاسا ہو دس لاکھ روپے اس کے سامنے رکھ دو مگر یہ اُس طرف نگاہ بھی نہیں اٹھائے گا۔ کہ اگر ایک روپیہ کا چھوٹا حصہ بھی چوری کر لوں تو خدا قیامت کے دن حساب کرے گا۔ تو ناممکن ہے کہ قیامت پر پختہ عقیدہ رکھنے والا جرم کرے۔ اگر بمقتضائے بشریت کر بھی لے تو بے چین ہوگا توبۂ نصوحا کرے گا۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں عورتیں تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر جرم کا اعتراف کرتیں اور اپنے اوپر خدا کے قانون کے اجراء کا مطالبہ کرتیں ایک خاتون سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔ وہ حد جاری کروانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ حضورؐ اسے ولادت تک مہلت دیتے ہیں اولاد ہوتی ہے۔ حضورؐ کے پاس آکر بچے کو گود میں

اٹھانے پیش ہوتی ہیں اور حد جاری کرنے کی پھر التجا کرتی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ بچہ شیر خوار ہے، اس حالت میں تم پر حد جاری نہیں کی جاتی، واپس جاتی ہیں۔ اور بچہ دو ڈھائی سال کا ہو گیا ہے تو پھر اسے اٹھا کر اپنے آپ کو پاک کرانے کا اصرار کر رہی ہیں۔ تو یہ صرف خدا کے خوف کا نتیجہ تھا، نہ گواہ نہ مدعی نہ کوئی اور ثبوت مگر سب سے بڑا ثبوت مسلمان کا عقیدۂ آخرت ہے۔

حضرت عائشہ اور فکرِ آخرت

دوسری وجہ نافرمانی کی یہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ عقیدہ تو رکھتا ہے مگر بڑا کم عقل اور بے وقوف ہے۔ ہماری ماں ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ خدا نے مجھے دس خصوصیتیں دیں خدا نے انہیں بڑا علم دیا تھا کہ بڑے بڑے صحابہؓ ان سے مسائل کی تحقیق کراتے معرکۃ الآراء مسائل میں ان کی رائے معلوم کی جاتی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت عائشہ حاضر ہیں حضرت جبرئیل وحی لے کر آئے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ حضرت جبرئیلؑ تمہیں سلام کہتے ہیں، آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ـــــ دنیا اور آخرت میں حضورؐ کی بیوی ہیں خدا کے نزدیک حضرت عائشہؓ کا اتنا درجہ ہے کہ منافقوں نے حضورِ اقدسؐ کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے آپ پر تہمت لگائی تو دس آیات میں خدا تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کی برات وصفائی کی، سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ کا یہ عالم تھا کہ حضرت عروہؓ مشہور محدث ہیں اور ان کے بھانجے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ستر ہزار روپے ایک دن میں خیرات فرمائے، اور میں نے جب قمیص دیکھی تو اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ ایک لاکھ روپے آئے تو باندی کے ہاتھ تھالی بھر بھر کر مستحقین میں تقسیم کرائے۔ افطارِ صوم کے وقت جو کی روٹی اور روغنِ زیتون سامنے رکھ کر روزہ افطار کیا۔ باندی نے کہا کہ آج ایک لاکھ روپے تقسیم کئے تو اگر ایک روپے کا بھی گوشت منگوا لیتے تو اب اس سے افطار کر لیتے۔ حضرت عائشہؓ نے غصہ سے کہا کہ اب کیوں پچھتاتی ہیں اور خیرات ضائع کراتی ہیں۔ اُس وقت کہہ دیتیں کس نے منع کیا تھا۔ گھر میں ایک دفعہ ایک روٹی تھی۔ اسے خیرات میں دیدیا اور پانی سے افطار فرمالیا۔ یہ ہماری ماں کی حالت ہے کہ لاکھوں روپے تقسیم کرتی ہیں مگر قمیص میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا خوف وخشیت تھا۔ روتی تھیں اور فرماتیں کہ کاش میں ایک پتھر ہوتی ایک درخت کا پتہ ہوتی، کاش پیدا نہ ہوتی کہ قیامت کے دن کے حساب سے بچ جاتی، اب کیا جواب دوں گی۔ تو یہ اثر تھا عقیدۂ آخرت کا۔

قیامت کی رسوائی

حضورؐ نے فرمایا میں جو کچھ دیکھتا ہوں اگر تم دیکھ سکتے تو آبادیوں سے باہر جنگل میں بھاگ جاتے۔ قیامت میں کھڑا ہونا بھی کسی ایک جلسہ یا اکوڑہ کے بازار میں شرمندگی نہ ہوگی بلکہ اولین وآخرین فرشتے جن وانس سب کھڑے ہوں گے، اگر عزت دار ہوا تو اصل عزت وہاں کی ہوگی اگر

بے عزت ہے، تو اصل بے عزتی وہاں کی بے عزتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر چور نے چوری کی ہو تو چوری کے مال کی گٹھڑی سر پہ اٹھائے ہوگا کسی کے کھیت سے گھاس کاٹا ہے تو گھاس پھونس کا گٹھا سر پہ ہوگا، چوری کی چادر ہے تو اس کا جھنڈا بن کر اس کے سر پہ لہرائے گا۔ ملک وملت اور دین کی غداری کرنے پہ تو الیتین (چوتڑ) کے بیچ میں جھنڈا نصب ہوگا کہ یہ ہے اسلام اور قوم وملک کا غدار۔ خدا کی قسم اگر کسی کا قیامت کے حق ہونے کا عقیدہ ہو تو مرنے کے لئے تیار ہوسکے گا۔ مگر جہنم کی آگ کیلئے نہیں اور اگر عقیدہ ہے اور پرواہ نہیں تو پھر وہ بڑا بے وقوف ہے کہ چند روزہ زندگی کو مقصد حیات بنا رکھا ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ عقلمند وہ ہے جو اپنے ساتھ دنیا میں حساب کرے، بچے دنیا کے امتحان کیلئے کتنی تیاری کرتے ہیں۔ حالانکہ محنت اور امتحان قابلیت پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اصل امتحان تو وہ ہے جو خدا کے سامنے ہو کہ حضورؐ اور اللہ کے ساتھ وفاداری کا اندازہ لگا لیا جائے۔ دنیا کی چند روزہ زندگی تو گذر جائے گی، غریب امیر بادشاہ سب مرتے ہیں ہم اپنے ہاتھوں سے انہیں دفناتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر عبرت نہیں۔۔

عقلمند اور احمق

تو عقلمند وہ ہے جو عمل۔ لما بعد الموت۔ کرے۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ احمق وہ ہے کہ خواہشات نفس کی پیروی میں لگا رہے۔ دل نے چاہا نماز پڑھ لی ورنہ نہیں دل نے چاہا چوری کر لی زنا کر لیا، تماشے اور سیر سپاٹوں میں لگ گیا۔ بس خواہشات کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ افرءیت من اتخذ الٰہہ ھواہ۔ کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔

الٰہ تو وہ ہوتا ہے جس کا حکم بلا چون وچرا مانا جائے۔ اب اسے اس کا نفس جو کہے وہی کرتا ہے۔ تو اس نے نفس کو الٰہ بنا دیا پیروی تو نفس کی ہے اور تمنا بخشش خداوندی اور جنت کی کرتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر احمق کون ہوگا۔؟

دیکھو خداوند تعالیٰ یقیناً رازق ہے۔

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔ زمین میں کوئی زندہ چیز نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ نے نہ اٹھایا ہو۔

ہر چیز سعی اور عمل سے وابستہ ہے۔

پھر زمیندار ایک ایک دانہ کیلئے کیوں اتنا فکر کرتے ہیں۔ کھاد، پانی، گوڈی ہر تکلیف برداشت کرتے ہیں، آرام سے بیٹھتے، کیوں نہیں؟ کیا خدا رازق نہیں۔؟ تجارت والے دن رات تجارت کے فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے شخص کو لوگ دیوانہ سمجھتے ہیں جو کوئی کام نہ کرے۔ دنیا کے معمولی کمال اور عزت وآرام کیلئے بھی لوگ ذرائع ڈھونڈتے ہیں، اور جنت کی بات ہو تو مفت میں

بلا محنت ٹھیکیدار بن جاتے ہیں، نہ خدا کا ڈر نہ رسولؐ کا نہ اسلام کا لحاظ، مادر پدر آزاد مگر جنّت کے ٹھیکیدار جو کا ٹکڑا بھی بلا مشقت و مزدوری کے حاصل نہ ہو سکے اور جنّت مل جائے تو کیسے ملے؟ اگر ایسا سمجھتا ہے تو سخت بے وقوف ہے۔ نزلہ و زکام کے علاج کے لئے ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جاتے ہیں، درد سر وغیرہ کیلئے دوڑتے بھاگتے ہیں۔ اور بدن میں ایک جزو بھی خراب ہے تو سارا بدن ٹھیک طرح کام نہیں کرتا۔ تو جب نہ عمل اسلام کے مطابق نہ زمینداری نہ تجارت نہ شادی غمی اسلام کے مطابق نہ رہنا سہنا اسلام کا۔ تو مفت میں جنّت اور اللہ کی سرخروئی کیسے مل جائے گی۔؟ حدیث میں تو آتا ہے کہ جس سے ایک عصر کی نماز فوت ہوئی اور قصداً فوت کیا تو۔ کانّما وتر اھلہٗ ومالہٗ ۔ گویا اس کے اہل وعیال اور مال و دولت سب کچھ اس سے چھن گیا۔

قبر کی زندگی تو قبر کی زندگی کے لئے ہمارے پاس کیا بنا رہی ہے۔؟ اس قبر کے لئے بھی کچھ کیا ہے۔ یہاں تو کوشش ہے کہ پنکھا ہو، بجلی ہو روشنی اور بستر ہو چارپائی ہو کشادہ مکان ہو مگر کبھی سوچا ہے کہ قبر میں کیا سامان ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی مرجاتے تو دو فرشتے اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے۔ اور وہ پوچھتے ہیں کہ کون ہے۔ مسلمان ہے یا کافر۔؟ تو دنیا میں تو چالاکی چلتی ہے۔ اور کرتے ہیں حاکم کے سامنے مگر قبر میں نہیں چلے گی اور قیامت کے دن بھی نہیں چلے گی۔ تو پوچھا جائے گا: من ربّک ۔۔؟ تمہارا پالنے والا کون ہے۔ تو جب دنیا میں ہم یہ سمجھتے رہے کہ مجھے دکان پالتی ہے، زمینداری پالتی ہے، میری زندگی کی ساری عزت نوکری سے ہے تو یہ شخص جب اپنا رب (پالنے والا) اپنی نوکری کو سمجھتا رہا تو قبر میں اب جھوٹ نہیں چلے گا۔ دنیا میں نماز کے لئے پکارا جاتا ہے کہ حیّ علی الصلوٰۃ ۔ تو یہ دکان بند کر کے نماز کے لئے جانے کی بجائے یہ سوچتا ہے کہ دکان بند رکھوں تو خریدار چلا جائے گا، کھاؤں گا کہاں سے؟ ملازم بھی یہی کہتا رہا۔ تو درحقیقت اس کا عقیدہ ہے کہ میرا پالنے والا خدا نہیں ہے، ورنہ سوچنا چاہئے تھا کہ دو ڈھائی سال کا جب بچہ تھا تو کس نے دودھ کا انتظام کیا اور کیڑے کی طرح کمزور و نحیف بچّہ تھا۔ سردی اور گرمی نہیں جانتا تھا۔ تو کس نے مجھے پالا۔؟ کاش ہم یہ جانتے کہ جس نے سورج چاند اور آسمان و زمین پیدا کئے۔ وہی رزق بھی دے گا تو حرام و حلال کی تمیز کیوں نہ کریں۔

حضرت عمرؓ کے دور کی خدا ترس لڑکی مگر آج تو مسلمان ہر چیز میں ملاوٹ اور ٹھگی کرتا ہے۔ دودھ میں پانی نہ ڈالیں تو بیچنے ہی نہیں۔ حضرت عمرؓ سے ڈرتے ہیں ان کا تخت و تاج حضرت عمرؓ کے قدموں میں ہے۔ ایسے حکمرانوں کی شہزادیاں حضرت عمرؓ کے دور میں مدینہ منورہ میں باندیاں بن کر آتی تھیں اور حضرت عمرؓ کا طریقہ رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے رات کو گشت کرنے کا تھا۔ ایک دن سحری کے وقت ایک

گلی میں آواز سنی کہ ایک گھر میں ایک ماں اپنی بیٹی کو کہہ رہی ہے۔ کہ اٹھو صبح قریب ہے۔ دودھ کے خریدار آئیں گے۔ دودھ میں پانی ملا دو بیٹی نے کہا ماں مجھے معلوم نہیں کہ امیرالمومنین نے غش (دھوکہ اور ملاوٹ) سے منع فرمایا ہے۔ اور حضورِ اقدس ؐ کا ارشاد ہے۔

من غشنا فلیس منا۔ جس نے ہمیں دھوکہ اور فریب دیا وہ ہم میں سے نہیں۔

ماں نے بیٹی کو کہا کہ ایسا کر لو یہ ہماری کمائی کا سوال ہے اس وقت کسے معلوم ہے؟ بیٹی نے کہا کہ اگر شرعاً ایسا کرنا حرام ہے تو یہ کام اللہ سے تو نہیں چھپ سکے گا۔ یہ تھا خدا کا خوف ارشادِ نبوی ہے۔

رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ۔ دانائی کی جڑ اللہ کا خوف ہے۔

صرف پولیس فوج اور حکومت سے اصلاح نہیں ہو سکتی نہ جمہوری حکومت سے نہ شخصی حکومت سے اوّل تو وہ مخلص نہیں ہوتے بالفرض ہوں بھی تو جب تک دل میں چوکیدار نہ ہو تو باہر کی نگرانی سے کچھ نہیں ہوتا جب سچا مسلمان ہو تو بھوکا رہے گا مگر کسی کے لاکھوں روپے کو آنکھ نہیں اٹھائے گا کہ چند پیسوں کے عوض چھ سات سو قبول نمازوں کا ثواب چھین لیا جائے گا۔ تو خدا کے خوف کا اثر دیکھو کہ ماں بیٹی کو ملاوٹ کا کہتی ہیں کہ حکومت کو تو خبر نہیں مگر بیٹی نے کہا کہ خدا تو دیکھتا ہے۔ حضرت عمر اس بچی کے تقویٰ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے بیٹے کو بلا کر کہا کہ شادی کرنی ہے تو ایسی دیندار لڑکی سے کر لو۔

حضرت عمر کا معیارِ شرافت حضرت عمرؓ کسی بھی حکمران یا رئیس کے گھر چاہتے بیٹے کی شادی کرا سکتے اور یہ تو ایک غریب بچی تھی۔ کہ دودھ تو غریب ہی بیچتے ہیں اور مدینہ منورہ میں قیصر و کسریٰ کی شہزادیاں باندیاں بنی ہیں۔ ایک حضرت علیؓ کو بھی عطا فرمائی تھی۔ اپنے بچے کی شادی بھی کسی مالدار جگہ کرا سکتے تھے۔ مگر خدا کے خوف کو ترجیح دی حدیث میں بھی ہے کہ شادی کرنا چاہو تو دیندار عورت کو ترجیح دو آج تو جنٹلمین لڑکی ڈھونڈتے ہیں حضورؐ کا ارشاد ہے مال پر نہ جاؤ دین کو دیکھو تو حضرت عمرؓ نے جب بچوں سے کہا کہ ایک ایسی لڑکی ہے۔ جس کے دل میں خدا کا خوف ہے تو ایک لڑکے نے مان لیا اور حضرت عمرؓ نے ان کا نکاح اس لڑکی سے کرا لیا اور اس رشتہ کو اللہ نے اتنا مبارک کیا کہ اسی لڑکی کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ مجددِ اوّل کو پیدا فرمایا اور اسی وجہ سے حضرت عمرؓ کا رنگ بھی ان پر غالب رہا۔ الغرض موت سے مفر نہیں اس لئے اسکی تیاری کرنی چاہئے ہم نے اسے ایک ہوّا بنا رکھا ہے۔ بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔

موت وصالِ حقیقی ورنہ موت کامیابی اور ایک نئی زندگی ہے مسلمان تو موت کو پسند کرتا ہے۔ خدا کی راہ میں موت آجاتی تو پکار اٹھتا۔۔۔ فزت و رب الکعبہ۔۔۔ صحابہ کرام میدانِ جہاد میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے جو شہید نہ ہوتا وہ روتا، موت فنا ہونا نہیں۔ دارِ ہموم و غموم سے دارِ امن اور

دارِ راحت کو منتقل ہونا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ مرض وفات میں ہیں۔ پیر کے دن ان کی صاحبزادی ام المومنین حضرت عائشہؓ حاضر ہوئی، کہا اباجان طبیعت کیسی ہے۔؟ حضرت صدیقؓ نے جواب دیا اے بیٹی یہ دو کپڑے جو پرانے ہیں میں نے پہنے ہیں۔ اسے دھو کر مرنے کے بعد اسی کا کفن بنا دو انہوں نے فرمایا اباجان تو امیر المومنین ہے، مسلمانوں کے بیت المال میں سب کچھ ہے۔ اور ہم خود بھی اللہ کے فضل سے آپ کو نیا کفن پہنا سکتے ہیں فرمایا نہیں نئے کپڑے زندوں کیلئے چاہئیں۔ مرنے کے بعد تو خون اور پیپ کیلئے پرانے کپڑے اچھے ہیں۔

پھر آپ نے حضورؐ کے کفن کی تفصیل دریافت کی، حضرت عائشہؓ نے بتلا دی فرمایا مجھے بھی ایسا ہی کفن پہنا دو، اور ایک مسلمان کی یہی کامیابی ہے کہ اس کا سب کچھ موت اور حیات میں حضورؐ کے طرز پہ ہو۔ فوز و فلاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی میں ہے، ہمارے لئے تو بہتے دریا خشک ہو جاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ حضورؐ کی پیروی کرتے تھے ایک صحرا میں خشک سالی کے شکار ہوئے۔ حیوانات بھی جنگل سے بھاگ گئے، علاء حضرمی صحابی کو شکایت کی فرمایا کیا ہم اللہ تعالیٰ اور حضورؐ پہ ایمان نہیں لاتے۔؟ کہا ہاں فرمایا تیمم کر کے دو رکعت پڑھ لو اور دعا کر دو، دعا کی اور گھوڑے نے پاؤں زمین پہ دے مارا، وہاں سے چشمہ اُبل پڑا۔

صحابہؓ اور تکوینی سنتوں کی پیروی

تو حضرت صدیقؓ نے صاحبزادی کو تعلیم دی کہ میرا کفن بھی حضورؐ کے مطابق ہو کہ بعد از موت بھی میری حالت ان کے مطابق ہو۔ پھر پوچھا حضورِ اقدسؐ کا وصال کس دن ہوا دنیا سے کس دن تشریف لے گئے تھے۔؟ فرمایا پیر کے دن تو حضرت صدیقؓ نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں اور خواہش ظاہر کی کہ کاش یہ سعادت تکوینی بھی خدا نصیب کر دے یہ تڑپ تھی وصالِ حقیقی اور موت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی خواہش موت میں بھی ہے۔ اسی حالتِ مرض میں عراقی فوج کے جرنیل مثنیٰ ابن صباح پہنچتے ہیں، عراق میں جنگ جاری ہے۔ اس نے حضرت صدیقؓ کو حالاتِ جنگ پیش کر دئے، آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا اور کہا کہ ہو سکتا ہے کہ آج میرا آخری وقت آ جائے تو کل تک بھی میرا جنازہ نہ روکیں۔ میری وجہ سے کسی نظام میں گڑبڑ نہ ڈالیں عراق کے مسلمانوں کو امداد کی ضرورت ہے ان کو تکلیف نہ پہنچے۔ صبح ہوتے ہی اس کام میں لگ جاؤ۔ یہ تھی رعایا اور مسلمانوں کی ہمدردی کی حالت، حضرت معاویہؓ اسلامی حکومت کے واحد حکمران ہیں عمر کی ترسٹھویں منزل میں ہیں۔ تو دعا فرماتے ہیں کہ کاش میں اس سال وفات پا جاؤں کہ حضورؐ کا وصال ۶۳ سال کی عمر میں ہوا۔ اس تکوینی سنت کی پیروی بھی ہو جائے، یہ تھا جذبۂ اتباعِ سنت اور اس جذبۂ سنت میں یہ حضرات موت

کو ایک محبوب چیز سمجھتے تھے۔ حضرت بلالؓ مرضِ وفات میں خوشی سے جھوم کر اشعار پڑھتے ہیں ؎

غداً نلقی الاحبۃ محمداً وحزبہ

کل میری ملاقات حضورِ اقدسؐ اور ان کے ساتھیوں سے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فکرِ آخرت اور موت کے لئے تیاری کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خطبہ جمعۃ المبارک یکم جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ
بعد از علالت پہلا خطبہ

تقریباً ایک ماہ غیر حاضری کے بعد اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ نے پھر حاضری کا موقع دیا۔ اس بیماری کے دوران اکوڑہ خٹک اور گرد ونواح کے مسلمانوں نے اس عاجز کے ساتھ ہر طریقہ سے ہمدردی کی، تقریباً ہر جگہ غائبانہ دعاؤں سے نوازا اس میں نہ صرف مرد بلکہ کئی جگہ خواتین نے بھی ختمِ کلامِ پاک اور دعائیں کیں۔ میں ناچیز اپنے آپ کو پہچانتا ہوں، یہ میرے ساتھ تعلق نہیں بلکہ صرف حسنِ ظن اور اچھا گمان ہے آپ لوگوں کا۔ اپنی محبت اور تعلق ہے خداوندِ کریم ان تمام حضرات کو اس حسنِ ظن کا بدلہ دارین میں دیدے اور اللہ تعالیٰ مجھے اس حسنِ ظن کا اہل بنادے۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے اور مہربان ہے۔

مرنے والوں کا ذکرِ خیر ایک حدیث میں ہے کہ جب ایک شخص کا انتقال ہو اور لوگ مرنے کے بعد گواہی دیں کہ یہ اچھا شخص تھا ہمدرد تھا۔ ملک اور وطن کو اس سے خیر پہنچا تو گو وہ حقیقت میں ایسا نہ ہو مگر کئی مسلمانوں کی اس گواہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کی گواہی کو سچا کر کے اسے بخش دیتا ہے۔ حضورِ اقدسؐ کے سامنے ایک دن ایک جنازہ گذرا صحابہؓ نے اس شخص کا ذکر کیا۔ خیر کا ذکر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وجبت۔ (لازم ہوگئی یہ شہادت) پھر کسی وقت دوسرا جنازہ آیا صحابہ کرامؓ نے اس کا ذکر بُرے طرح کیا کہ بدکار تھا وغیرہ۔ تو حضورؐ نے فرمایا۔ وجبت۔ (واجب ہوگئی) حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ آپ نے دونوں کے بارہ میں وجبت فرمایا۔ تو فرمایا کہ لوگوں نے ایک کی خوبیاں ظاہر کیں، اور دوسرے کی برائیاں، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی ان کی شہادت کے مطابق معاملہ فرمائیں گے۔ تو اللہ کے نزدیک ایک مسلمان کی بڑی عزت ہے ایک حدیث میں آتا ہے کہ بہت سے پراگندہ حال پراگندہ مال لوگ کہ کوئی اسے دروازہ بھی نہ کھولے اور اسے دھتکارے اس کے نکاح کا پیغام بھی کوئی قبول نہ کرے

گوشۂ گمنامی میں ہیں لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہے۔ میلا کچیلا ہے۔ مگر: لواقسم علی اللّٰہ لابرّہٗ ـــ کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکلے کہ واللّٰہ خدا اس کام کو ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسکی بات کی لاج رکھ کہ اس کام کو پورا کر لیتا ہے۔ کہ میرے اس بندہ کی بات غلط نہ ہو۔ تو فرمایا: اذکروا موتاکم بالخیر ـــ اپنے اموات کا ذکر خیر اور بھلائی سے کیا کرو۔

اور اصل گواہی تو دل کی ہے کہ دلوں کے اندر سے اچھی شہادت اور خلوص ومحبت کے کلمات نکلیں تو دنیا میں ایسی زندگی گذارو کہ جب یہاں سے جاؤ تو لوگ روئیں ایک شاعر کا کہنا ہے کہ دنیا میں زندگی ایسی گزارو کہ جب تم جاؤ تو سب رونے لگیں اور تم ہنستے ہوئے جارہے ہو۔ جب کہ پیدا ہو رہے تھے تو رو رہے تھے۔ (کہ بچے کو فطرتِ سلیمہ کی وجہ سے پیدائش کے ساتھ ذمہ داریوں کا احساس ہوجاتا ہے۔ اور رونے لگتا ہے۔) تو شاعر کہتا ہے کہ لوگ خوشی سے ہنستے تھے اور بچہ رو رہا تھا۔ مگر جب دنیا سے جائے تو یہ محبوب حقیقی کے وصال کی خوشی میں ہنستا رہے اور لوگ اس کے فراق میں آہ و بکا کرتے رہیں۔

اہلِ جنت اور دوزخ اللہ تعالیٰ نے دونوں مٹھیوں میں انسانوں کے ارواح کو بند کیا۔ (اور مٹھی بھی جو اللہ کی شان کے مطابق ہو۔) پھر حضرت آدمؑ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اس مٹھی میں اہلِ جنت ہیں ـــ ولا اُبالی ـــ اور مجھے کوئی پرواہ نہیں اور دوسری مٹھی میں اہلِ جہنم ہیں۔ ولا ابالی۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ کوئی جنت میں جائے یا جہنم میں جائے۔ خداوند کریم بے نیاز ذات ہے۔ یہ ساری دنیا آباد رہے یا ویران ہوجائے اُسے کیا ضرر پہنچ سکتا ہے تو ایک عالم نے جب یہ حدیث سُنی تو کہا اب میں کس طرح ہنس سکتا ہوں اور رونے لگا کہ جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ میری روح کونسی مٹھی میں تھی نہیں ہنسوں گا۔ قسم کھائی کہ پھر نہیں ہنسوں گا۔ اور اس عہد کو نبھایا۔ جب انہیں وفات کے بعد غسل دینے کیلئے تختہ پر لٹایا گیا تو کھل کھلا کر ہنس پڑے اب معلوم ہوا ہوگا۔ کہ میرا نام اہلِ جنت میں ہے۔

دنیا ایک خواب الغرض ہم تو نیند میں ہیں۔ فرمایا: الناس نیامٌ اذا ماتوا فانتبھوا - لوگ خواب میں ہیں جب مرجائیں تو بیدار ہوجائیں گے۔ بچہ سوتے میں بعض اوقات ہنستا ہے، یہی حال ہمارا اور ہماری دنیوی زندگی کا ہے کہ خوشی عارضی ہے اور ایک خواب ہے غفلت کی وجہ سے ہے فرمایا: لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً۔ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر وہ تم جان لو تو بہت کم ہنسوگے اور بہت زیادہ رونے لگوگے

کسی کے سر پہ سیشن کا مقدمہ ہو کل عدالت میں پیشی ہو اور پھانسی کا امکان ہو تو لوگ جتنی بھی ہنسی خوشی کریں مگر یہ شخص اپنے غم میں مبتلا رہے گا۔ دنیا و ما فیہا سے بے خبر کل کے غم میں گھلتا رہے گا۔ حالانکہ پھانسی بھی دنیا

کا غم ہے جو ایک سیکنڈ کی بات ہے جو روح کی جدائی کا لمحہ ہے۔ مگر کیا ایسا شخص سینماؤں اور تھیٹروں میں جائے گا۔؟ خوشی کرے گا۔؟ ڈانس ناچ گانوں میں مشغول ہو سکے گا۔؟ وہ تو متفکر ہی رہے گا۔

حسن بصریؒ کا فکرِ آخرت حسن بصریؒ راستہ پر چلتے تو ایسے متفکر اور مغموم ہوتے جیسے انہیں مقتل میں لے جایا جا رہا ہو، بعض شاگردوں نے وجہ پوچھی تو جواب میں فرمایا کہ شاید حسنؒ کے منہ سے کوئی ایسی بے مقصد بات نکلی ہو اور خدا نے فرمایا کہ تمہارے سب اعمال بے کار ہیں، میرے دربار سے راندہ ہو ایسی بات تم نے کیوں کہی تھی۔؟ جب یہ خیال ہے اور امکان ہے تو میں کس طرح بے فکری کی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ یہ اس حضرت حسنؒ کی بات ہے جو زہد و تقویٰ علوم حدیث و قرآن کے بادشاہ ہیں مگر فکرِ آخرت کا یہ عالم ہے۔

محاسبۂ آخرت بھائیو! دنیا کی موت تو ایک منٹ کی تکلیف ہے مگر دوزخ کی تکلیف تو دنیا سے لاکھوں چند زیادہ ہے۔ وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے بے حساب زیادہ گرم ہے۔ اور ابد تک یہ حالت کہ جسم کا چمڑا جلے تو دوسرا چمڑا اس پر آجائے۔ پھر جب ہر ہر قدم ہر ہر بات ہر ہر حرکت کا حساب دینا ہوگا۔ کہ کس طرح کمایا؟ کہاں خرچ کیا؟ صبح سے شام تک زندگی کے ہر لمحہ کا محاسبہ ہوگا۔ پھر دنیا کے حاکم کے سامنے نہیں احکم الحاکمین کے سامنے ذرہ ذرہ کا حساب۔ اللہ اکبر۔ تو وہ عالم جس نے نہ ہنسنے کا عزم کیا تھا اس کے بعد ۴۰ سال تک زندہ رہا کبھی نہ ہنسا اس غم سے کہ میری روح کہاں جائے گی؟ مرنے کے بعد غسل کے لئے ڈال دیا تو قہقہہ لگا کر ہنسا، اب اسے پتہ چلا کہ اہل جنت میں سے ہوں۔

غالباً حضرت مولانا گنگوہیؒ نے لکھا ہے کہ بہتر تو یہ ہے کہ لوگ دل سے میت کی تعریف کر دیں اور اگر ایسا نہ ہو تو زبانی تعریف بھی تفاؤلاً کر دو۔ اتنی اچھائی تو مردے کے ساتھ کر سکتے ہو کہ منہ سے دو چار جملے نکالے کہ اچھا بندہ تھا تو شاید اس ایک بات سے خداوند تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیں۔ تو عرض کر رہا تھا کہ مجھے اپنی حیثیت معلوم ہے۔ صرف آپ کا محض حسنِ ظن ہے۔ لوگوں کی شفقت اور ہمدردی ہے۔ چونکہ ان کا باطن صاف ہے اور دین کے ساتھ ان کو محبت ہے اور جن پر گمان ہے دین کا ان کے ساتھ بھی محبت ہے حضورؐ نے فرمایا کہ: حب الانصار من الایمان ۔ انصار سے محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرض کو قدرے افاقہ دیا۔ نظر کی تکلیف تا حال ہے۔ مگر قدرے فرق آیا ہے۔ آپ بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

روحانی صحت کا فکر ضروری ہے۔ بزرگو! یہ ہماری کوتاہی ہے کہ جسم مریض ہونے پر تو ہسپتال اور ڈاکٹروں کے پاس بھاگتے رہتے ہیں۔ تو کاش ہمیں یہ بھی احساس ہوتا کہ جسم کیطرح روح بھی بیمار ہوتی ہے۔

جسم کی طرح روح بھی خسارہ میں پڑتی ہے۔ چاہئے کہ ہم روح کی بیماریاں بھی معلوم کریں اور یہ دیکھیں کہ مجھے دین کے لحاظ سے کتنا نقصان اور خسارہ ہوا ہے۔

دینی خسارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس مرد اور عورت سے ایک نماز قضا ہوئی تو کانما وتر اھلہٗ ومالہ۔ گویا اس کا اہل وعیال اور مال و دولت سب کچھ لٹ گیا ہو۔ —— الترغیب والترہیب میں نماز عصر قضا ہونے کا بھی قید نہیں۔ دوسری روایات میں عصر کی نماز کی قید ہے۔ گویا ایک نماز کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اتنا بڑا خسارہ اور نقصان ہے کہ گویا اس کے اہل وعیال، جائیداد سب فوت ہوئے اور تباہ ہوئے، جیسا کہ تقسیم ملک کے وقت بعض لوگوں کا سب کچھ لٹ گیا۔ تو ہم ایک فٹ زمین کے لئے کتنی جدوجہد کرتے ہیں، مقدمے لڑتے ہیں۔ مرتے مارتے ہیں۔

—— تو حضورؐ نے فرمایا کہ ایک نماز کے فوت ہو جانے سے اتنی تباہی ہوئی کہ اس کا سب کچھ چھینا گیا، تو جسمانی تکالیف اور امراض کے احساس کی طرح ہمیں روح کا بھی احساس ہونا چاہئے، ایک برے عمل کی وجہ سے روح پہ جو اثر ہوتا ہے۔ اس کے تدارک کیلئے ہم کیا کرتے ہیں۔؟

کاش! ہم روح کے امراض کا بھی علاج کراتے اس کا بھی کبھی سوچتے روح کے علاج کا ہسپتال قرآن و حدیث ہیں اس سے روح کیلئے نسخے معلوم کرو۔ اللہ کی یاد سنت کی پیروی اللہ کی تابعداری سے روح کو صحت ہوتی ہے جتنی بھی تابعداری ہو اتنی روح کو جلا ہوگی۔

اب تمام مخلصین کے حق میں دعا کریں جنہوں نے مجھ غریب سے ہمدردی کے سلسلہ میں تکالیف اٹھائیں۔ ——

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(تبییض و ترتیب: سمیع الحق دوران اسارت ہری پور سنٹرل جیل۔ مئی ۱۹۷۷ء)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اسلامی ملکوں میں نظامِ تعلیم کی اہمیّت

اور وہاں کی قیادت اور فکری رجحانات میں اسکے دُور رس اثرات

یہ گرانقدر مقالہ پچھلے سال ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے دوران تعلیمی مسائل پر مجلس مذاکرہ میں پیش کیا گیا۔ مولانا ندوی کا یہ مقالہ شاید اس موضوع پر بعض حیثیتوں سے حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس میں پوری صراحت، توازن اور صحیح نتائج اور علمی شواہد کے ساتھ ممالک اسلامیہ میں موجودہ نظامِ تعلیم کی خامیوں اور اس کے طبعی اور دور رس اثرات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اصل مقالہ عربی میں تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا کی نظر ثانی کے بعد پیش ہے۔ مقالہ ان خاص اور بیش قیمت تحریروں میں سے ہے جو روز روز مرتب نہیں کی جاسکتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں، تعلیمی اور علمی مراکز کے ذمہ داروں اور ماہرینِ تعلیم سے ہماری خصوصی گذارش ہے کہ اس پر ایک نظر ضرور ڈالیں۔

—— مرتب ——

بزرگانِ محترم اور رفقائے کرام!

میں اس فرصت اور صحبت کو جو زمانۂ طویل کے بعد میسّر آئی ہے غنیمت سمجھتے ہوئے اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ایک ایسے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک امتِ مسلمہ اور عالمِ اسلام کے موت وزیست اور وجود اور عدم وجود کے سوال کے مرادف ہے۔ میں پوری دیانتداری اور یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ بین الاقوامی اسلامی اجتماع اس اہم اور نازک موضوع پر گہری ہمدردی اور سنجیدگی سے غور کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہم اس کو ایک مبارک اور تاریخ ساز اجتماع کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی تو وہ ملتِ اسلامی کی حیاتِ نو کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔

حضرات! آپ کی اجازت سے میں اس موضوع پر کسی قدر تفصیل اور وضاحت وصراحت کے

ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں، موضوع کی نزاکت اور اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ کہانی بہت دور سے شروع کی جائے۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ آج کا یا چند مہینوں اور سالوں کا نہیں ہے۔ یہ ایک بہت قدیم مسئلہ اور پرانی مشکل ہے۔ جسکی جڑیں ملت کی زندگی اور تاریخ میں اندر تک پیوست اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اس مسئلہ میں پہلی نفسیاتی حقیقت جس سے صرف نظر کرنا ناممکن ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ میں ایسے اشخاص کا وجود ہے، جن کو اس عقیدہ پر (جس پر اس معاشرہ کی اساس ہے) قلبی طور پر انشراح نہیں ہوتا اور وہ ان حقائق و مبادی اور مقاصد اور اقدار پر یقین نہیں رکھتے جن کے لئے یہ معاشرہ زندہ اور کوشاں ہے یہ دراصل ہر اس انسانی معاشرہ کا مزاج اور خاصہ ہے جو کسی مخصوص عقیدہ اور متعین حدود و قیود کا پابند ہے اور جب اس معاشرہ اور جماعت کا کوئی فرد ان حدود کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ اس کے دائرہ سے خارج یا اس کا باغی قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان حقوق و امتیازات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جو اسکو اب تک حاصل تھے۔ برخلاف قومیتوں کے جن کا دروازہ ہر عقیدہ و مسلک اور ہر قسم کے صحیح اور غلط طرزِ زندگی اور کردار کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اور ان کی صرف ایک شرط ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ فرد اپنی قومیت تبدیل نہ کرے۔ حکومت یا ملک کے خلاف کوئی سازش نہ کرے اور کسی قومی غداری کے جرم کا مرتکب نہ ہو۔

یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور جن لوگوں پر اس معاشرہ کے اچھے بُرے کی ذمہ داری ان کے لئے سب سے سنگین مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ عنصر (جس نے اس عقیدہ کو کبھی اخلاص کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا یا کسی وجہ سے اس کو ہضم نہیں کر سکا تھا، یا کسی خاص سبب سے ہضم کرنے کے بعد اسے پھر خارج کر دیا تھا۔) اس مومن و مسلم معاشرہ کے دائرہ اور فریم کے اندر اس کے ایک جز کی حیثیت سے زندہ رہنا اور پھلنا پھولنا چاہتا ہے۔ اور اپنے مستقبل کو کسی مصلحت یا مجبوری سے اس کے مستقبل کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ اپنے کو اس کے مطابق ڈھالنا، اس کے رنگ میں رنگنا اس کو کسی حالت میں گوارہ نہیں ہوتا۔ وہ اس معاشرہ کے مسلّم و بنیادی حقائق و تصوّرات اور صفات و خصوصیات پر یقین نہیں رکھتا۔ اور نہ اس کے اندر اس کے لئے کوئی گرم جوشی اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ بات فتنۂ ارتداد سے زیادہ خطرناک۔ فتنہ انگیز اور دور رس ہے۔ جسکی سنگینی سے ہمارا مسلم معاشرہ واقف ہے یہ مسئلہ اس وقت کچھ اور پیچیدہ بن جاتا ہے۔ جب یہ عنصر اپنی ذہانت و ہنر مندی سے عوامی اعتماد حاصل کرنے اور دوسروں پر چھا جانے کی وجہ سے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد پورے معاشرہ کو اس راستے پر لے جاتا ہے۔ جو اس کے نزدیک الحاد و بے دینی اور اس کے طے شدہ

اصولوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کے راستے ہیں۔ بعض اوقات اس کو ان مقاصد کی طرف بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جو اس کے دین و عقیدہ کے سراسر منافی یا اس کے متوازی ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسی عمیق نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہوتا ہے جس سے زیادہ سخت کشمکش تاریخ انسانی تاریخ اخلاق و نفسیات اور تاریخ مذاہب میں شاید ہی کبھی پیش آئی ہو۔ وہ موت و زیست کی درمیانی اور بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ جس سے اس کو کسی وقت چھٹکارا نہیں ملتا۔

اس قیادت کے اثر سے جو اپنے معاشرہ اور قوم کے دین و عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتی بلکہ اکثر اوقات اس سے برسرِ پیکار اور آمادۂ فساد رہتی ہے۔ فکری و ذہنی ارتداد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے اور ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد جن کے پاس اخلاقی و نفسیاتی حفاظت کا کوئی سامان یا ایمانی و روحانی قوت کا کوئی ذخیرہ یا کوئی علمی و فکری حصار نہیں ہوتا۔ اس سمندر میں غرقاب ہو جاتی ہے۔ دولت کے پرستار، چڑھتے سورج کے پجاری، موقع پرست، ابن الوقت اس کا خصوصیت سے اور زیادہ آسانی سے شکار ہوتے ہیں، یا پھر دوسری شکل میں نفاق پورے معاشرہ میں عام ہو جاتا ہے، معاشرہ کی داخلی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کا پورا ڈھانچہ اندر اندر سڑنے لگتا ہے، مکر و فریب عام ہوتا ہے۔ سازشوں کی کثرت ہوتی ہے۔ غداری اور قومی خیانت کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں، ضمیر اور بڑی سے بڑی قابلِ احترام اور مقدس میراث کا سودا ارزاں اور آسان ہوتا ہے، ملک کے بڑے بڑے رقبے چند سکوں کے عوض فروخت کر دئے جاتے ہیں۔ جاسوسوں اور دشمن کے کارندوں اور ایجنٹوں کی بن آتی ہے۔ اور ان کو اس خدمت کے لئے کوئی بھی طریقہ اور حربہ استعمال کرنے سے دریغ نہیں ہوتا۔ یہ وہ صورت ہے جس کی نظیر کسی اور انسانی معاشرہ میں (جس کو یہ سخت آزمائش پیش نہیں آئی ہے یا جس کے عوام اور قیادت کے درمیان اتنی وسیع، گہری اور بنیادی و نظریاتی خلیج نہیں ہے۔) نہیں ملتی۔

اس کے نتیجہ میں یہ معاشرہ کسی بیرونی دشمن یا اندرونی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کی اصل وجہ یہی ذہنی انتشار اور نفسیاتی کشمکش، قیادت اور اس کے دئے ہوئے اعلانات اور نعروں سے عوام کی بے تعلقی اور عدم دلچسپی ہے۔ یہ سب حالات و واقعات کا منطقی نتیجہ اور نفسیاتِ انسانی کا طبعی خاصہ ہے اور ان تمام ملکوں کی قدیم و جدید تاریخ اس پر گواہ ہے۔ جو اپنے قائدین و زعماء یا اپنے حکام و امراء کی محبت سے کبھی آشنا نہیں رہے۔ اور جہاں جمہور اور قیادت میں جذباتی ہم آہنگی اور فکری یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکی

البتہ اس اسلامی سوسائٹی نے جو خود دعوت اسلامی کی اساس پر قائم تھی اور جس نے نبوت محمدیؐ کی آغوش تربیت میں پرورش پائی تھی اس طبعی اور تاریخی حقیقت اور امرِ واقعی کا کامیابی سے مقابلہ کیا جس کا واسطہ قدرتی

طور پر اس جماعت کو پڑتا ہے جس کی تعمیر ایمان و عقیدہ دیانت و تقویٰ اور دعوت و جہاد کی بنیادوں پر ہوئی ہو۔ نفاق کی بیماری تو صرف اس ماحول کو لگتی ہے۔ جہاں دو حریف نظریات اور مقابل قیادتیں پائی جاتی ہوں خواہ ان دونوں میں ضعف و قوت اور قلت و کثرت کے لحاظ سے کوئی تناسب نہ ہو۔ اس موقع پر وہ متردد عنصر سامنے آتا ہے۔ جو ان دونوں مخالف کیمپوں کے درمیان گھومتا رہتا ہے اور متردد رہتا ہے۔ کہ ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے اور کس کا دامن تھاما جائے۔ پھر کسی نہ کسی دعوت کی طرف مائل ہو کر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اس کو اپنی محبت و تعلق کا مرکز بنا لیتا ہے۔ تاہم اس کی مادی مصلحتیں اور حریف کی قوت اور عروج و اقبال اس کو اپنے موقف کے اعلان، اپنی رائے کے اظہار اور نئی دعوت کو بالکلیہ قبول کرنے سے باز رکھتا ہے اور مقابل دعوت سے اپنی رسم و راہ قطعی اور آخری طور پر ختم نہیں کرتا، قرآنِ مجید میں اسی کیفیت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

"مذبذبین بین ذلک لا الی ھؤلآء ولا الی ھؤلآء (نساء ۱۴۳)

بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں نہ ان کی طرف (ہوتے ہیں۔) نہ ان کی طرف۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"ومنھم من یعبد اللّٰہ علیٰ حرف فان اصابہ خیر اطمأن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علیٰ وجھہ"۔ لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کنارے پر (کھڑے ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں اگر ان کو کوئی (دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں۔ (یعنی پھر کافر ہو جائیں)

اسی لئے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ مکہ میں نفاق کا وجود نہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام وہاں مغلوب تھا۔ اس کے اندر نفع و نقصان پہنچانے اور تغیر و تبدل کی کوئی طاقت نہ تھی اور وہاں دو متوازی قوتیں نہ تھیں، مشرکین بڑے طاقتور اور غالب تھے مسلمان مظلوم تھے اور مغلوب تھے۔ جب اسلام مکہ سے مدینہ منتقل ہوا اور اسلامی سوسائٹی اپنے تمام لوازمات اور طبعی خاصیتوں کے ساتھ وجود میں آئی تو نفاق نے سر اٹھایا، یہ ایک ایسی قدرتی اور نفسیاتی صورتِ حال تھی جس سے کوئی مفر نہ تھا۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے اور سلسلۂ وحی کی وجہ سے یہ نوزائیدہ سوسائٹی ان منافقین کے ضرر سے محفوظ رہی۔ قرآنِ مجید نے متعدد جگہوں پر ان کو اچھی طرح بے نقاب کیا ہے، عام مسلمان بھی ان سے واقف اور بیزار و متنفر تھے۔ سوسائٹی نے بھی ان کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا تھا۔ اور ان کے لئے اس کے اندر چوری چھپے گھسنے اور خلل اندازی کرنے کا زیادہ موقع باقی نہیں رہا تھا۔ سوسائٹی

کے اعتماد کو حاصل کرنے اور منصب و اقتدار تک پہنچنے کی بات تو بہت دور کی تھی، چنانچہ یہ اوّلین اسلامی سوسائٹی برابر صحت مند اور ان آلائشوں سے محفوظ رہی، نفاق اس کو کمزور اور کرم خوردہ نہ بنا سکا اور منافقین کو بھی اس کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکا۔ بلکہ ان کی کمزوری، شکست خوردگی اور بدحالی کو دیکھ کر بہت سے صحابہؓ کو جن میں بڑے جلیل القدر صحابی بھی شامل تھے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ان کی نسل ختم ہو چکی ہے اور عہد نبوی کے بعد اب نفاق کا کوئی وجود نہیں رہا۔ لیکن نفاق پہلے بھی انسانی زندگی کا ایک خاصہ اور بہت سے لوگوں کی کمزوری تھا اور آج بھی ہے۔ اس نے کسی وقت قافلۂ انسانی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ اور ہر موقع اور گنجائش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنی جگہ بنائی ہے۔ بہت سے اسباب و عوامل نے (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) اسکی ہمت افزائی کی اور اس کو تخت سلطنت، حربی قوت اور انتظام حکومت کی منزل تک پہنچایا نیز علم و ادب کی محفلوں میں اس کو باریابی کا موقع دیا اور یہ سب اس عہد میں ہوا جب اسلام پیش قدمی کر رہا تھا، فاتح و با اقتدار تھا۔ اور اسلام قبول کرنے اور اسلامیت کا مظاہرہ کرنے میں بہت سے سیاسی اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی تھے، یہ وہ موقع تھا جب نفاق نے آگے بڑھ کر وسیع اسلامی سلطنت کے کلیدی اور اہم عہدوں پر قبضہ کر لیا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے کسی خاص فن یا صنعت میں اپنی مہارت کی وجہ سے یا غیر معمولی ذہانت یا علمی برتری کی وجہ سے نوزائیدہ اسلامی حکومت پر پورا تسلط حاصل کر لیا اور ان میں بڑے اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتوں کے لوگ افواج کے سپہ سالار اور ادبا و اہل علم اور حکومت کے اہل کار پیدا ہوئے۔

ان حالات میں ایک مرتبہ سیدنا حسن بصریؒ سے نفاق اور منافقین کے موجودگی کے بارے میں سوال کیا گیا درانحالیکہ اقتدار اسلام اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے اثبات میں اس کا جواب دیا اور صرف ان کے وجود کی تصدیق نہیں کی بلکہ اس کا اظہار کیا کہ وہ طاقت کی پوزیشن میں ہیں۔ ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت! کیا آج بھی نفاق کا کہیں وجود ہے۔؟ انہوں نے جواب دیا کہ "اگر منافقین بصرہ کی گلیوں کو چھوڑ دیں تو تم کو ویرانی کی وجہ سے وحشت ہونے لگے"۔ ایک مرتبہ فرمایا۔" اگر وہ نکل جائیں تو تم اپنے دشمنوں سے عہدہ برآنہ ہو سکو"۔ ایک موقع کہا۔" خدا کی شان اس امت کو منافقین نے کتنا نقصان پہنچایا اور کس طرح اس پر قبضہ کر لیا[1]

اس کے بعد غیر ملکی اقتدار اور مغرب کی فکری و تہذیبی یلغار کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور مشرق

---

[1] یہ اقتباسات محدث ابوبکر کی کتاب "صفۃ النفاق وذم المنافقین" سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۶۸

اپنے ارادہ سے یا بلا ارادہ مغربی طرزِ تربیت، نظامِ تعلیم، دبستانِ فکر، زندگی اور انسان کے مغربی تصور اور علوم وفنون کے مغربی زاویہ نگاہ کے سایہ میں یا زیادہ بہتر الفاظ میں اس کی گود میں اس طرح آجاتا ہے جیسے کوئی شیر خوار بچہ کسی دیرینہ سال مربی واتالیق کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ وہ اس کے پورے نظامِ تعلیم یا مختصر الفاظ میں اس کے نظریۂ تعلیم کو ساری خرابیوں اور خامیوں کے باوجود جوں کا توں قبول کر لیتا ہے۔ جو ایک ایسی سرزمین میں پیدا ہوا اور نافذ کیا گیا جس کے عقائد، بنیادی اصول، اخلاقی قدریں، اسلامی معاشرہ کی قدروں اور بنیادی ومسلمہ اصولوں سے ہر جگہ اور ہر سطح پر مختلف ہیں، جن پر وہ پورا ایمان رکھتا ہے۔ یا ان پر ایمان لانا، ان کے لئے جد وجہد کرنا ان کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی دینا اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ بلکہ مغرب کی اخلاقی قدروں کی تردید اور ان کی بیخ کنی اور تحقیر ہی پر اس کی بنیاد ہے۔ ایسی حالت میں اس کی مثال بعینہٖ اس شخص کی سی ہوتی ہے۔ جو آبِ حیات کے شوق میں زہر کا پیالہ پینا چاہے، یا کھاری اور نمکین پانی سے اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرے۔

انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور علمی اداروں کی تشکیل میں بیرونی ملکوں کے تعلیمی مشیروں کو پورا اختیار دے رکھا ہے۔ اور ان ملکوں سے صرف درسی کتابیں نہیں درآمد کر رہے ہیں۔ وہ ان ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں۔ تاکہ وہ مغربی ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ کی تربیت میں نشو ونما حاصل کریں، پھر ان کو ممالکِ اسلامیہ کے تعلیمی منصوبوں اور پالیسیوں کی تشکیل وتربیت کی پوری آزادی بھی دے دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں ان کا نقشہ بنائیں اور ان کا جو رُخ چاہیں متعین کریں۔ اس کے نتیجہ میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو اپنے عقائد وافکار اور اپنے اخلاق وسیرت سب میں ذہنی انتشار کا شکار ہے، فکرِ مغربی اور فکرِ اسلامی کے درمیان تذبذب کی حالت بھی لیسا غنیمت تھی لیکن اس نے اکثر اوقات اپنے ملک وملت اور اپنے معاشرہ کے سارے معتقدات ومسلمات اور اصول واقدار سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی جس پر کوئی تعجب نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مقامِ تعجب تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ماہرین اور مشیرانِ تعلیم اور ان کے شاگرد اپنے کام میں مخلص ہوں اور اس تعلیمی پالیسی اور منصوبہ بندی میں ان کے پیشِ نظر اسلامی ملکوں اور نئی نسلوں کی فلاح وترقی ہو، لیکن یہ فرض کر لینے سے بھی ان ملکوں میں پیدا ہونے والے فکری اضطراب اور بنیادی تضاد اور ناہمواری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور تصویر اسی طرح تاریک رہتی ہے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی اس خامی کو اس پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ دین سے اور اس کی بنیادوں اور اصولوں سے مسلم اقوام کے

مزاج و کردار اور ان کی شخصیت و دعوت کے مطابق اور منافی دونوں چیزوں سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ان ملکوں اور قوموں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہوں لیکن ان کو بچانے کی یہی کوشش ان کی ہلاکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ان غیر ملکی تعلیمی مشیروں کے سلسلہ میں مجھے DAN ADAMS کا یہ تبصرہ بہت پسند آیا جو اس نے اپنی کتاب EDUCATIONAL PATTERNSIN CONTEMPORARY SOCIETIES میں کیا ہے۔

ایک مشرقی حکایت غیر محتاط غیر ملکی تعلیمی مشیروں سے سرزد ہونے والی غلطیوں کی پوری تصویر کشی کرتی ہے۔ کسی زمانہ میں ایک بہت بڑا سیلاب آیا جس میں ایک بندر اور ایک مچھلی پھنس گئے، بندر تیز و طرار اور تجربہ کار تھا۔ لہذا ایک درخت پر چڑھ کر وہ سیلاب کی طوفانی موجوں سے محفوظ مقام پر جا بیٹھا، اب اس نے نیچے نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ غریب مچھلی امنڈتی ہوئی لہروں کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہے پوری ہمدردی اور نیک نیتی کے جذبہ کے ساتھ وہ نیچے آیا اور اس نے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا پھر جو نتیجہ نکلا وہ ظاہر ہے [1]

عہدِ حاضر کے ماہرین تعلیم نے بالاتفاق اس کا اظہار کیا ہے کہ:

"تعلیم کوئی ایسا تجارتی سامان نہیں ہے جو درآمد یا برآمد کیا جا سکے مثلاً مصنوعات، کچا مال یا وہ ایجادات و ضروریات جو کسی ملک اور علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ ایسا لباس ہے جو ان اقوام کے قدوقامت و جسامت کی ٹھیک ناپ کے مطابق تراشا اور سیا جاتا ہے۔ اور پسندیدہ و محبوب علم و فن اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ جن کے لئے وہ ہر طرح کی قربانی دے سکتی ہیں [2]

اور یہ کہ:

"تعلیم صرف اس عقیدہ کو مضبوط کرنے کا ایک مہذب اور شائستہ طریقہ ہے۔ جس کا حامل یہ ملک یا قوم ہے۔ اس کا مقصد فکری طور پر اس کو غذا دینا اس پر اعتماد پیدا کرنا اور اگر ضرورت ہو تو علمی دلائل سے اس کو مسلح کرنا ہے، وہ اس عقیدہ کے دوام و بقا کا وسیلہ اور بے کم و کاست آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے کا ایک طریقہ ہے، نظامِ تعلیم کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ والدین اور

---

[1] I.N. THUT ANDDON ADAMS: EDUCATION PATTERNS IN CONTEMPORARY SOCIETIES" MOGRAW HILL BOOK CO. NEW YORK. PAGE. 63

[2] "نحو التربیة الاسلامیة الحرة۔"

مربیوں اور نگرانوں کی اس سعی پیہم کا نام ہے جو وہ اپنی اولاد کو اپنے دین ومسلک پر قائم رکھنے کے لئے کرتے رہتے ہیں اور ان کی اس طرح تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ورثہ کے (جو انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے حاصل کیا تھا۔) صالح واہل وارث اور امین ثابت ہوں، اور ان کے اندر اس ثروت میں اضافہ اور توسیع اور اس کو ترقی دینے کی پوری صلاحیت ہو۔[1]

برطانیہ کے ماہرینِ تعلیم کی ایک رپورٹ میں یہی بات کہی گئی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"ریاست کا مفاد اس میں ہے کہ وہ دیکھے کہ اسکولوں کے ذریعہ قومی زندگی کے مکمل اجزاء نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہیں۔ اس کا کام ہے کہ یہ دیکھے کہ طلبہ قومی مفاد کے مقررہ معیار کی کارکردگی کو قائم رکھتے ہیں اور اسے ترقی دیتے ہیں۔ ریاست کی ظاہری تعلیمی سرگرمی کے پس پشت غیر مرتب لیکن معاشرہ کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے۔ کہ بچے قومی خصوصیات کے جانشین بنتے ہیں۔"

گارفورڈ (GAR FORD) نے اپنی کتاب "EDUCATION AND SOCIAL PURPOSE" میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

اوّلین طور پر تعلیم کے مقصد کو سماج کی روایات اور اس کے موجودہ اقدار پر رکھنا چاہیئے، کیونکہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر اس کی خصوصیات اور بقا منحصر ہے۔ اور یہ بے حد ضروری ہے۔ کہ ان دونوں کے درمیان دفعتاً کوئی بے ربطی نہ پیدا ہو۔ اس کی بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ترقی کی ہر کوشش سماج کے مسلّم اقدار کی بنیاد پر ہو۔[2]

ایک اور ماہر تعلیم VERNON MALLINSON کی شہادت میں اس سے زیادہ یقین اور صراحت سے کام لیا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

ایک قسم کا ذہنی منشور جو پورے معاشرہ کے مشترکہ مقصد اور مشترکہ کوششوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ایک طرح بڑے پیمانہ پر قومی جذبہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ان خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو معاشرہ کے نصب العین کی خوبی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔[3]

---

[1] اس کی تائید میں ملاحظہ ہو مشہور ماہر تعلیم جان ڈیوی کی فنِ تعلیم پر تصنیفات اور تحریریں نیز مقالہ (ADUCATION مندرجہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکہ۔

[2] "F.W. GAR FORD. "EDUCATION AND SOCIAL PURPOSE" London (1962) P- 146/47

[3] AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF COMPARTIVE EDUCATION London. 1957 (Page-4)

مغرب اپنے سیاسی نظاموں اور مکاتب خیال کے اختلاف، نیز اپنے مشرقی و مغربی کیمپوں اور اپنی ساری قومی بیماریوں اور نقائص اور خامیوں کے باوجود اس تعلیمی پالیسی پر پوری طرح کاربند ہے۔ اور تعلیم و تربیت کے تمام شعبوں میں اس نے اس کو تمام و کمال نافذ کر رکھا ہے۔ اور اس کے تمام تعلیمی پروگرام اور تعلیمی پالیسیاں اسی مقرر کردہ اصول کی تابع ہیں۔

سوویت یونین بھی جو انقلابی ذہن اور اپنی انتہا پسندی میں مشہور ہے، اس اصول کو نافذ اور جاری کرنے میں سرمایہ دارانہ جمہوری حکومتوں سے پیچھے نہیں رہا، بلکہ شاید اپنے اشتراکی نظریہ کی حفاظت اور انقلابی روح کی بنا پر اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں وہ ان ممالک سے بھی آگے ہے۔

ایک سرکاری حکم نامہ مجریہ ۱۲ نومبر ۱۹۵۸ء میں یہ کہا گیا ہے کہ۔

" ان خصوصیات کے حصول میں سماجی علوم (SOCIAL SCIENCES) کی تعلیم ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مارکسزم، لینن ازم کے مبادیات کا علم ہر فن کے ماہرین کے لئے اشد ضروری ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی تربیت اس طرح ہونی چاہیئے کہ ان میں بورژوا نصب العین اور احیاء پرستی کے خلاف تعصب کی روح سرایت کر جائے " ۔

یہی وہ چیز ہے کہ جس کی وجہ سے مغرب اس نقصان سے محفوظ رہا جس کا شکار مشرق کے اسلامی و غیر اسلامی ممالک سب ہیں۔ چنانچہ آج مغرب میں عوام اور قیادت یا جمہور اور حکومت میں کسی گہری اور وسیع نظریاتی، ذہنی و فکری خلیج کا سراغ نہیں ملتا، وہاں صرف ایک طرز اور ایک آئیڈیل اور ایک قسم کے اصول و نظریات اور مقاصد و نصب العین پائے جاتے ہیں، وہاں مختلف طبقات اور سوسائٹی کے افراد کے درمیان کسی قسم کی ذہنی اور نفسیاتی رسہ کشی نہیں اور اسی وجہ سے یہ ممالک اندرونی سازشوں اور بغاوتوں سے محفوظ ہیں۔

مغرب کے بعد ان مشرقی ممالک کا نمبر آتا ہے۔ جو مدّت دراز سے اپنا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے اور ان کو ان حقائق پر یقین نہیں جن کی ایمان بالغیب اور انبیاء کی تعلیمات و ہدایات پر بنیاد ہے۔ ان کے پاس متعین آسمانی تعلیمات یا محفوظ آسمانی صحیفے بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف ان قومی روایات اور جماعتی و شخصی مفادات کی حامل ہیں جن کو یہ تعلیمی نظام اور پروگرام چیلنج نہیں کرتے اور کسی جگہ ان دونوں کا کہاس نہیں ہوتا۔

چنانچہ یہ ممالک بھی اسی طرح اس تضاد سے محفوظ ہیں جو مغربی نظامِ تعلیم پیدا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انہوں نے اس نظامِ تعلیم سے صلح و صفائی کر لی ہے۔ اور دونوں میں پوری مفاہمت پائی جاتی ہے، یا انہوں نے اپنے آپ کو ان تعلیمی و تربیتی نظریات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اور اسی لئے انقلابات

اور سازشوں کا تناسب یہاں بہت کم اور تضاد بھی بہت کم یا اتنا کمزور ہے کہ قومی زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا، ملک سے غداری اور قومی خیانت کے واقعات شاذ و نادر ہوتے ہیں، اور یہاں بھی عوام اور رہنما طبقہ میں وہ وسیع خلیج حائل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی ملکوں میں نظر آتی ہے۔ ان ممالک کے امراض اور ان کے عیوب دوسری نوع کے ہیں۔ اور اس کے اسباب و عوامل بھی بالکل دوسرے ہیں جن کا تعلق ان کی تاریخ، ان کے قومی مزاج مخصوص عقائد دینی حاسہ کی کمزوری، شعور کی کمی اور نظامِ تعلیم و تربیت کے فساد سے ہے۔

جہاں تک اسلامی ممالک کا تعلق ہے وہاں یہ کشمکش اور عجیب تضاد بڑے وسیع پیمانہ اور مختلف سطح پر پایا جاتا ہے۔ وہاں ایک طرف حکومت اور جمہور میں کشمکش ہے۔ دوسری طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کم پڑھے لکھے یا ناخواندہ لوگوں میں رسہ کشی ہے۔ تیسری طرف دیندار اور آزاد خیال اور ترقی پسند افراد دست و گریباں ہیں اور یہ سب نتیجہ ہے اس نظامِ تعلیم کا جو مغربی ملکوں سے درآمد کیا جا رہا ہے۔ یا مغربی ذہن اور نظامِ تعلیم کے خطوط پر خود ان ملکوں میں تیار کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ان عقائد اور حقائق کو پوری طرح ہضم اور قبول نہیں کر پاتی، جن پر اس کے معاشرہ اور اس امت کی بنیاد ہے۔ اس لئے کہ یہ نظامِ تعلیم جس طرح کے خیالات کی آبیاری اس کے دل و دماغ میں کرتا ہے وہ ان حقائق اور عقائد سے کھلے طور پر متصادم ہیں جو اس معاشرہ کے لئے ناگزیر ہیں، کبھی خارق عادت طریقہ پر یا کسی بیرونی اثر سے وہ اس کو قبول کر تی ہے، تو لازماً اس کے نتیجہ میں یہ نظامِ تعلیم ضرور کمزور پڑتا اور دیتا ہے۔ لیکن ایسا بہت شاذ و نادر ہوتا ہے۔

جب یہ طبقہ اس نظام کی آغوش میں تربیت پا کر نکلتا ہے۔ تو قوم کے عقیدہ، خیالات اور جذبات سے اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے، اگر وہ قوی الارادہ ہوتا ہے تو وہ رجعت پسندی کے ملبہ کو (جیسا کہ اس طبقہ کے معین افراد یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔) راستہ سے ہٹا کر اپنی قوم و ملک کو ماضی کے بارِ گراں سے رہائی بخشنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر ایک ایسی طویل کشمکش برپا ہوتی ہے جس پر ملّت کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں بے دریغ خرچ ہوتی ہیں۔ اور اندرونی خانہ جنگیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بیرونی جنگوں سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ ان ممالک کا قصّہ ہے۔ جہاں ایسی قیادتیں برسرِ اقتدار تھیں جو انقلابی، قوم پرستانہ اور لادینی فلسفوں اور دعوتوں پر یقین رکھتی تھیں۔

اگر اس طبقہ کی قوتِ ارادی کمزور ہوتی ہے۔ اور وہ طاقت و شخصیت سے محروم ہوتا ہے۔ تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اندر ان عقائد اور مقاصد کی طرف سے دلی نفرت پیدا ہو جاتی

ہے۔ وہ آئے دن اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا ہے۔ غیر ملکوں اور بیرونی طاقتوں سے سازباز کرلیتا ہے۔ اور عوام کے قومی جذبہ اور دباؤ اور علماء و دعوتِ دین کے علمبرداروں کے اثر و رسوخ سے پہلی فرصت میں چھٹکارا حاصل کرلینا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں غداری کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ ممالک مستقل طور پر بے یقینی، خوف و دہشت، ذہنی انتشار اور شبہ و بے اعتمادی کی فضا میں رہتے ہیں۔

اس غیر فطری اور غیر ضروری صورتحال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کہ اس پورے تعلیمی نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کرکے نئے سرے سے ایک نیا نظامِ تعلیم تیار کیا جائے جو اس ملت اور امت کے قد و قامت پر راست آتا ہو اور اسکی دینی و دنیاوی ضروریات پوری کر سکتا ہو۔

یہ عالمِ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ اسکی سب سے اہم اور ناگزیر ضرورت، وقت کی آواز اور اسلامیانِ عالم کا سب سے بڑا فرض ہے۔

اس مسئلہ کا حل خواہ وہ کتنا ہی دشوار نظر آرہا ہو اور صبر آزما اور وقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سرِ نو ڈھالا جائے اور اسکو امتِ مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزاء سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم و خواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بجائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح اس میں جاری و ساری کر دی جائے۔ اس مقصد کیلئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنا ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا اس کی قیادت و امامت کا انکار کرنا پڑے گا۔ اس کے علوم و نظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا۔ اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ مغرب کی کامیابیوں اور پیش قدمیوں نے انسانیت اور تہذیب کو کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اس کے علوم کے ساتھ موادِ خام (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرنا ہوگا۔ اور اس سے وہ چیزیں تیار کرنا ہوں گی جو ان قوموں اور ملکوں کی اپنی ضروریات رجحانات اور ان کے عقیدہ و تہذیب سے ہم آہنگ ہوں۔

"اس راہ میں اگرچہ بہت سے سنگِ گراں ہیں اور نتائج بھی بہت تاخیر سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تجدد پسندی، آزاد خیالی، اور مغرب کی ذہنی غلامی کی اس طوفانی موج کو روکنے کا واحد طریقہ ہے۔ جس نے

عالمِ اسلام کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلا کر رکھ دیا ہے ۔ اور اسلام کے فکری و اجتماعی ڈھانچہ اور ملتِ ابراہیمی کے شیرازہ کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے ۔ اور جس کے نتیجہ میں مسلم اقوام کے پُرجوش اسلامی جذبات ان کی سادہ دلی اور گرمجوشی ان کی قربانیاں اور سرفروشیاں اور اخلاص و وفا کی قیمتی سوغات (جس کا ان حکومتوں کے قیام اور غیر ملکی اقتدار سے آزادی میں سب سے بڑا اور براہِ راست دخل ہے ۔) افرنگیت اور مغربیت کے تنور کی حقیر ایندھن بن رہی ہے ، سادہ لوح ، بے زبان ، سچے اور مخلص مسلم عوام ، خاموشی اور سکون کے ساتھ بکریوں کے ریوڑ کی طرح نامعلوم منزل کیطرف ہنکائے جارہے ہیں اور یہ طبقہ ان کی قسمت کا مالک بن گیا ہے ۔ (نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ ۔ ص ۴۳-۴۵)

کیا آج کوئی اسلامی ملک اور کوئی اسلامی حکومت ، کوئی بڑی اسلامی یونیورسٹی اس آواز پر لبیک کہہ سکتی ہے ۔ اور اپنی ساری کوششیں ، توجہات اور ذرائع و وسائل اس اہم تعمیری اور انقلابی نقطۂ آغاز پر مرکوز کر سکتی ہے جو بالآخر عالمِ اسلام کو اس سب سے بڑے خطرہ اور چیلنج سے بلکہ مکمل تخریب کے اس عمل سے (جو جاری ہے اور جس سے بڑی عمومی ، ہمہ گیر ، دور رس قومی تباہی و بربادی ہمیں اقوام و مذاہب اور تہذیب و تمدن کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی ۔) بچا سکتی ہے ۔؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

* ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ ۔ (۲-۱۹۵) اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو ۔

دوسری جگہ ارشاد ہے :

* ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ۔ (۱۷-۳۱) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا ۔

یہ قتلِ معنوی اس قتلِ جسمانی سے کسی طرح کمتر نہیں ، اس زود اثر اور مہلک زہر میں جو چشم زدن میں انسان کو موت کی نیند سلا دے اور اس زہر میں جس میں انسان گھٹ گھٹ کر مرے نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے ۔ اور قرآن مجید نے دونوں سے منع کیا ہے ۔

* ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما ۔ (۴-۲۹) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ خدا تم پر مہربان ہے ۔

محبتِ الٰہی

افادات مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے
صدر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج پشاور

—— —— مرتبہ مولوی فضل حق ترنگ زئی متعلم دارالعلوم حقانیہ

جو مومن ہے وہ عاشق ہے، قرآن کریم میں آتا ہے : والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ ۔ اللہ کو دل دے دینے کا نام ایمان ہے، ہر مومن کے دل میں اللہ کی محبت کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔ جہاں ایمان ہوگا وہاں خدا کی محبت ہوگی محبت کی دو صورتیں ہیں ایک ہے محبت طبعی یا فطری دوسری عقلی یا شرعی انسان فطرت میں خدا سے محبت کرتا ہے۔ خدا نے ازل میں جب روحوں کو پیدا کیا اس پر اپنی ربوبیت کی تجلی فرمائی اور پوچھا الست بربکم۔ سب پکار اٹھیں بلیٰ۔ محبت کی تخم ریزی ہوگئی۔ فطرت میں محبت الٰہی ودیعت ہوگی ایسا پتھر دل کون ہوگا جس کے سامنے وہ شہ دلربا آجائے۔ میر نے اچھا کہا ہے ؎

وہ شہ دلربا جب سامنے آجائے ہے
تھامتا ہوں دل کو لیکن پہلو سے نکل جائے ہے

خدا کو دیکھے اور اس سے پیار نہ کرے۔ پیار کے چار وجوہ ہوتے ہیں، یا جمال کی وجہ سے پیار ہو جاتا ہے۔ یا انسان کسی کمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ یا نوال کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ کہ شریف آدمی محسن کا چاہنے والا ہوتا ہے۔ یا عظمت و جلال سے متاثر ہو کر بڑائی کا قائل ہو کر چاہنے لگتا ہے۔ خدا سے زیادہ جمال والا کون ہے، وہ خود کتنا حسین ہوگا جس نے تمام حسن کو پیدا کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہ جمیلٌ۔ کمال کے لحاظ سے دیکھو تو حقیقت میں خدا سے زیادہ کمال والا کون ہوگا۔ الحمد للّٰہ سب کمال و جلال سب خوبی و جمال، نوال و عطاء اس کے لئے ہے، بہت پیارا و سب سے اعلیٰ وارفع ہے، جہاں کہیں سے جو کچھ کسی کو ملا ہے یا ملے گا یا ملتا ہے تو اُس ذات متعال سے ہے، ایسے دینے والے سے پیار نہیں کروگے۔ تو کس سے کروگے، جسم دیا، جان دی روح دی نان دیا اگر وہ نہ چاہے تو ایک پل کے لئے ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اس سے زیادہ عظمت و شان والا کون ہوگا، گویا جو بھی خوبی و محبوبی و کمال کسی کے دل کو کھینچ سکے۔ تو وہ اللہ کی ذات میں ہے، اس لئے اللہ نے اپنا اسم ذات جو بنایا وہ اللہ ہے۔ جو ولہٌ سے نکلا ہے ولہٌ اس جلن و سوز کو کہتے ہیں جو کسی محبت

کی وجہ سے دل میں ہوتی ہے۔ تو اللہ دلوں کا پیارا ہے۔ جس کی محبت میں دل مچل اٹھے اللہ کا معنیٰ دلوں کا محبوب۔ تو جب اس سے پیار نہیں کرو گے تو کس سے کرو گے۔ تو دل میں بسانے کے لائق صرف اسکی ذات ہے۔ اس لئے غیروں کو دل میں لانا دل کا بے محل استعمال ہے جسے ظلم کہتے ہیں۔ اس لئے قرآن نے شرک کو ظلمٌ عظیمٌ کہا ہے۔ جب دوسرا دل میں آتا ہے تو ظلم ہے۔ جب غیر کی محبت دل میں آتی ہے۔ تو گویا شرک ہو جاتا ہے۔ کس کو لیتے ہو، کس سے محبت کرتے ہو، خدا کے ہوتے ہوئے بھی غیروں سے محبت، اس جیسا کوئی رحیم و کریم اور محسن نہیں، جی چاہتا ہے کہ اس سے خوب پیار کرے ایک گڈریا جنگل میں بیٹھا تھا، کہنے لگا اے اللہ تو کہاں ہے کہ میں تیری خدمت کروں، تیرے لئے روغنی روٹی لاؤں، تیرے پاؤں دباؤں وغیرہ وغیرہ۔ اُس راستے پر موسیٰ علیہ السلام کا گذر ہوا، کہا کس سے باتیں کر رہے ہو کہا کہ خدا سے باتیں کرتا ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کافر ہو گیا، تھپڑ لگایا وہ بھاگ گیا، موسیٰ علیہ السلام پر وحی ہوئی، کہا کہ میرا بندہ میرے ساتھ لگا تھا۔ میرے بندے کو مجھ سے جدا کر دیا۔

موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ اللہ میاں وہ تو کفر بک رہا تھا۔ ارشاد ہوا۔ تو برائے وصل کردن آمدی۔ نہ برائے فصل کردن آمدی۔ حکم ہوا جا تلاش کر کے لاؤ۔ پیچھے گئے، گڈریا نے کہا کہ موسیٰ تیری ایک بات مجھے پار کر گئی۔ جو میاں نے دینا تھا وہ دے دیا۔ پہلے میری محبت طبعی تو تھی تیرے طمانچہ نے مجھے محبت کے اس مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں حقائق کھل جاتے ہیں۔ اب سمجھ گیا کہ محبت طبعی محبت شرعی کے ماتحت ہونی چاہیئے۔ حضرت سید صاحبؒ فرمایا کرتے تھے۔ جوشِ طریقت ہوشِ شریعت کے تابع ہو۔ محبتِ طبعی ہر ایک میں ہوتی ہے۔ یہ محمود ہے، مقصود نہیں۔ مقصود شرعی یا عقلی محبت ہے۔ جو کہ حدود ہی کی پابند ہو۔ ایک عاشق وہ جو اپنے جذبے کو دیکھتا ہے۔ ایک عاشق ہے، جو محبوب کے جذبے کو دیکھتا ہے سچا عاشق وہ جو محبوب کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کر دے جو اپنی چاہت پر قربان ہوتا ہے۔ وہ ابوالہوس ہے۔ غالبؔ کا شعر ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۔۔۔ اب آبروئے شیوہ اہلِ نظر گئی

عشق نام ہے، محبوب کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کرنا جو اپنا دل خوش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ محبوب کے دل کو خوش کرتا ہوں۔ بدعتوں میں پھنسا رہے گا۔ محب محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔ محبت الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ خدا کو بھی ایسے چاہو جیسے وہ چاہتا ہے کہ اسے چاہو ؎

نہ یہ چاہتا ہوں نہ وہ چاہتا ہوں ۔۔۔ خدا کے لئے میں خدا چاہتا ہوں

خدا کی محبت ادب کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے۔

ادب سے دیکھ لیں مشتاق دور سے ان کو   مجال ہے جو انہیں کوئی ہم کنار کرے

حبِ الٰہی کا تقاضا عظمتِ الٰہی ہے۔ جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی اتنی تعلیم حکمِ الٰہی بڑھتی چلی جائے گی، محبت کا یہ بھی خاصہ ہے کہ محبوب ناراض نہ ہو جائے اسے شریعت میں خشیتِ الٰہی کہتے ہیں خشیت سانپ، بچھو، یا شیر بھیڑیئے کے ڈر کی طرح نہیں بلکہ محبوبِ حقیقی کے ناراض ہو جانے کے اندیشے کا نام ہے، اس لئے قرآن میں رحمان سے خشیت کہا ہے۔ من خشی الرحمٰن بالغیب۔ محب کے لئے بڑی بات ہوتی ہے محبوب کا ناراض ہونا۔ میاں روٹھ جائے گا۔ چہرہ پھیرے گا۔ تمام شہر راضی ہو اور محبوب ناراض ہو تو اس سے بڑا نقصان کیا ہو گا۔ وہ راضی ہو اور سب ناراض ہو جائیں تو کیا نقصان ہے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ تمام دنیا تمہیں قطب و ابدال کہیں اور خدا کے نزدیک مردود ہو تو تمہارا کیا فائدہ اور اس کے نزدیک مقبول ہو اور دنیا تمہیں مردود کہے تو تمہارا کیا نقصان، عاشق بدنام کو پرواہ ننگ و نام کیا۔ میرا ایک شعر ہے ؎

مجھ کو کسی سے کیا غرض جب تو ہے میرا مدعا

دل میں فقط تو ہی رہے اتنی ہے میری التجا

یہ عاشق سوختہ ساماں ہوتے ہیں محبت ایک تیر ہے جو دل میں لگتا ہے یہ روشنی کا تیر ہے جو دل کو محبت و معرفت سے منور کر دیتا ہے۔ جب پیارا وہی ہو گیا تو غیر پر کیا نگاہ کرے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ کی تکمیل بغیر حبِ تام کے نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فرمایا: والذین آمنوا اشد حباً للّٰہ۔ عاشق ضابطہ کو نہیں دیکھتا وہ منشائے محبوب پر نظر رکھتا ہے، کیسے اور کیوں پر اسکی نگاہ نہیں ہوتی عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن۔ دل بدست دیگراں دادن و حرماں بودن۔ اللہ میاں کو دل دے کر اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزارنا۔ جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی۔ اتنا مطیع و فرمانبردار ہوتا چلا جائے گا۔ نری محبت جس میں طاعت نہ ہو چھچھورا ہے۔ جس محبت میں اتباع ربانی نہیں، حقیقتاً نفس کا فریب ہے۔ عاشق کا شیوہ ہے ؎

ارید وصالہ و یرید ھجری   فاترک ما ارید لما یرید

؎ میل ما سوئے وصال و میل او سوئے فراق   ترک کار خود گرفتم تا بر آید کار دوست

اس کے بندے تو پکار اٹھتے ہیں۔

؎ فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از غیر او تمنائے

اور ان کا حال یہ کہتا ہے ؎

میری چاہت تیری چاہت   تیری چاہت میری چاہت

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس سے اسکی رضا کے سوا دوسری چیز مانگنا بے کار ہے۔ میاں کے بن کر اسی میں لگے رہو اس کی چاہت پر اپنی چاہت کو قربان کر دو جو تصرف کرے تکوینیاً و تشریعاً اس کے لئے تیار رہو۔ اگر اس کی رضا کے لئے جان بھی چلی جائے تو سستا سودا ہے۔ مجازوالے کہاں سے کہاں تک پہنچتے ہیں۔ مولا کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہو مولانا روم فرماتے ہیں :؎

عشق مولیٰ کے کمتر از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اللہ کے تصرفات کے سامنے گیند بننا چاہیے، جدھر کو پھینکا ادھر کو چلا، تراش خراش جو کہ مالی باغ میں کرتا ہے۔ باغ میں کرتا ہے باغ کو خوبصورت بنانے کے لئے کرتا ہے اگر یہ تصرفات نہ ہوں تو آدمی آدمی بنا نہیں کرتا۔ یہ تصرفات نفس کو مارتے ہیں۔ عشق کا تقاضا ہے۔ "میں ہوں" کا مٹانا اور حب نفس سے یہ نکل جائے تو آدمی بن جاتا ہے۔ محبت کہتے ہیں اپنے کو میاں کے حوالے کر دو۔ جو بھی تصرف کرے اس پہ راضی رہو ؎

زخم پہ زخم کھا کے جی اپنے لہو کے گھونٹ پی آہ نہ کر لبوں کو سی عشق ہے دل لگی نہیں

ہر تصرف کو اپنی فلاح و بہبود سمجھے اور یقین رکھے کہ اسی میں میری خیر ہے، حکیم کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ تم راستے پر چل رہے ہو پیچھے سے کوئی آیا آنکھوں پہ ہاتھ رکھا۔ بہت غصہ آیا جب ہاتھ ہٹایا دیکھا محبوب ہے۔ اب چاہو گے آنکھیں تو نکال دے، لیکن ہاتھ نہ ہٹائے راضی بہ رضا ہو۔ شیخ جیلیؒ کا قول ہے۔ اپنی رضا کو مولیٰ کی رضا پہ قربان کر دو تو دنیا میں جنت کا مزہ آئے گا موت بھی پیاری ہو جاتی ہے، محبت ایسا سیماب ہے۔ جس میں بے قراری میں قرار آتا ہے۔

؎ ایں حرف نشاط آوری گویم و می رقصم از عشق دل آساید بہ ایں ہمہ بے تابی

مومن کے دل میں محبت کی چنگاری تو ہوتی ہے، لیکن اب اتنی بھڑک اٹھے کہ دوسری محبتوں کو جلا دے اور ان پہ غالب آجائے خدا کے لئے سب کچھ بھی قربان کرنا پڑے تو باک نہ ہو، ایک شخص ہمارے بزرگوں میں کسی کے پاس آئے کہنے لگے کہ اللہ کی محبت ہے، لیکن شادی کے بعد خدا کی محبت سے زیادہ دلہن کی محبت معلوم ہوتی ہے۔ بزرگ نے فرمایا کہ اگر وہ اللہ میاں کو برا بھلا کہے تو پھر محبت رہے گی کہنے لگا اگر وہ ایسا کہے تو میں سزا کے طور پہ اس کے سر کے بال کاٹ دوں گا۔ حضرت نے فرمایا دیکھو اللہ کی محبت دل میں ہوتی ہے۔ اگر بڑھانا چاہتے ہو تو دل جلوں کی صحبت میں بیٹھے ؎

جو آگ کی تاثیر وہی عشق کی تاثیر ایک خانہ بہ خانہ ہے ایک سینہ بہ سینہ ہے

یہ محبت کی چنگاری دلوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ اہل حق کی صحبت اختیار کرو یہ چنگاری تم کو بھی پھونک دے گی، لیکن خدا کا جلا ہوا پھول بن جاتا ہے۔ جل کر تو دیکھو اس کی آگ میں، اس کے احکام کی تعمیل اسکی رضا کے لئے اختیار کرو اور کہو کہ اے اللہ اپنی رضا کی خاطر میرے اندر کو اپنی محبت سے جلا دے۔

دردم را بعشق خویشتن سوز — بہ تیر درد دل جان و دلم دوز

دلم از نقش باطل پاک فرما — براہ خود مرا چالاک فرما

اے اللہ ایسی محبت عطا فرما دے جو کبھی بجھ نہ سکے، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا۔ اللہ کا ذکر رضائے حق کے لئے کرو لیکن دھیان محبت میں ڈوب کر کرو۔ اللہ میاں اپنی نگاہ کو میرے دل پر جمائے ہیں اس کی پیار بھری نگاہیں میرے دل کو موہ رہی ہیں۔ اگر اللہ کی محبت غالب نہ ہو تو غیر کی محبت آدمی کو راہ سے ہٹا دیتی ہے طبعی محبت کے متفاوت مدارج ہیں، ماں چاہے نہ چاہے بچے سے محبت ہوتی ہے۔ اسلام طبعی محبت کے تقاضے کو ختم نہیں کرتا بلکہ پابند حدود کرتا ہے۔ محبتِ ایمانیہ کا دائرہ خدا سے شروع ہو کر پوری مخلوق کو اپنے دائرے میں لے لیتا ہے۔ منبع محبت خدا کی ذات ہے۔ محبت کی اصل سزاوار صرف ایک اللہ کی ذات ہے۔ اب جب غیر سے محبت ہو گی وہ خدا سے فرع کے طور پر ہو گی خدا جس سے کہے محبت کرو اس سے محبت اور جس سے بغض کا کہے اس سے بغض کرو۔ الحب للہ والبغض للہ۔ ہمارا دل صرف اسی کا ٹھکانا ہو اور بزبان حال پکار رہا ہو ہے

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

فرقہ ذکریہ پر ایک نظر

یہ فرقہ بلوچ قوم تک محدود ہے، اور قدیم مکران کی حدود میں رہ رہا ہے۔ البتہ موجودہ وقت میں ان کے بعض افراد صوبۂ سندھ میں بھی آباد ہیں، لیکن یہ وہی ہیں جو حسب مقتضائے حالات مکران چھوڑ کر وہاں جا بسے ہیں۔ ان کی آبادی اور ماڑہ۔ لیبئی۔ کراچی۔ گچک۔ درخشاں (مضافات پنجگور)۔ کولواہ۔ مشکے۔ جھاؤ وغیرہ علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ان کی کل آبادی کراچی سے لیکر مکران تک تقریباً تیس ۳۰ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔

تاریخی پس منظر جیسا کہ اس فرقے کا خیال ہے۔ یہ فرقہ مہدویہ کی ایک شاخ ہونے کا اور سید محمد جونپوری کے پیرو ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ ہر چند کہ ان دونوں فرقوں میں عقائد سے لیکر اعمال تک زبردست فرق ہے، لیکن حسبِ دعویٰ فرقے، یہاں سید محمد جونپوری کے مختصر حالات درج کرنا خالی از مصلحت نہ ہوگا۔

بقول تذکرہ نگارانِ ہند سید محمد جونپوری بمقام جونپور (صوبۂ اودھ) میں ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے پورا نام میران سید محمد تھا۔ باپ کا نام سید خان اور بقول بعض سید یوسف تھا۔ والدہ کا نام بی بی آغا ملک بتایا جاتا ہے۔ البتہ بعد میں مہدویوں نے والدین کے نام عبداللہ اور آمنہ سے بدل دیئے ہیں۔ شروع جوانی میں علوم مروجہ سے فراغت حاصل کی اور شیخ دانیال چشتی کے مرید ہوگئے۔ درویشی اختیار کی تارکِ دنیا ہوگئے۔ اسی دوران مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور علماء کی مخالفت نے کسی بھی ریاست میں ٹکنے نہ دیا۔ مریدین سمیت صبح بیت اللہ کو روانہ ہوا۔ طواف کے دوران دوسری بار رکن و مقام کے درمیان کھڑے ہو کر "انا المہدی" کا نعرہ لگایا اور ایک دو مریدوں نے تصدیق کی۔ صبح بیت اللہ شریف سے فراغت پاکر بقول بعض دوبارہ ہندوستان پہنچا۔ لیکن حالات نے دوبارہ نکلنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ سندھ سے ہوتا ہوا کوئٹہ کے راستے سے افغانستان چلا گیا اور فراہ[1] کے مقام ۹۰۰ھ یا ۹۱۰ھ یا ۹۱۲ھ میں حسب اختلاف روایات وفات پائی۔ مریدین بکھر گئے۔ ہندوستان میں اس فرقہ کو سلیم شاہ سوری نے تقریباً ختم کر دیا۔ البتہ حیدرآباد

---

[1] فراہ ہرات و قندھار کے درمیان ایک علاقہ ہے۔

دکن میں اس کے کافی لوگ پائے جاتے ہیں۔

مہدویہ کے بعض عقائد ۱۔ ان کے نزدیک۔ سید محمد جونپوری کو مہدی ماننا فرض ہے۔ اور انکار کفر

۲۔ سید کے ساتھی تمام انبیاء علیہم السلام سے، سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، افضل ہیں۔

۳۔ احادیث نبوی صلعم کی تصدیق سید محمد جونپوری سے ضروری ہے۔

۴۔ انبیاء کے اجزاء مسلمان تھے اور انصاف نامہ کی روایت کے مطابق پورا مسلمان تو صرف سید محمد جونپوری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۵۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان اور خاتم النبیین ہیں۔

۶۔ تصحیح کا عقیدہ :۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مرنے کے بعد تمام ارواح کو ایک دفعہ سید محمد جونپوری کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ وہ ان کی تصحیح کریں گے۔ جو وہاں مقبول ہوا، مقبول اور جو مردود ہوا، مردود ہے۔

۷۔ تقسیم بالسویہ :۔ اگر یہ فرقہ کے افراد میں سے کوئی مرے تو ترکہ مع وارثوں کے باقی لوگوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے، ان کے تفصیلی عقائد فضائل اور انصاف نامہ وغیرہ کتب مہدویہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ظہور مہدی اور نزول عیسیٰ علیہ السلام بموجب عام عقیدہ ظہور مہدی کے ساتھ نزول عیسیٰ بھی ضروری ہے۔ چنانچہ سید محمد جونپوری کی وفات کے بعد حاجی محمد فرہی ایک شخص نے جو سید صاحب کے مریدین میں سے تھا۔ عیسیٰ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اور ٹھٹھہ سندھ میں آکر اعلان کیا کہ میں عیسیٰ اور مسیح موعود ہوں اور حاکم سندھ نے اسے قتل کرا دیا۔ سید محمد جونپوری کے بیٹے سید محمود کو جب معلوم ہوا کہ یہ مسیح موعود ہونے کا مدعی ہے۔ تو آپ نے اس کو قتل کرنے کیلئے دو آدمی بھیجے لیکن حاکم سندھ نے پہلے ہی سے میدان صاف کر دیا تھا۔ یہاں تک تو اس فرقہ کے حالات تذکروں میں اور کتب تواریخ میں مل سکتے ہیں تفصیل حالات معلوم کرنے کیلئے تذکرۂ آزاد۔ تذکرۂ اولیاء ہند، منتخب التواریخ طبقات اکبری اور مہدویہ کی اپنی کتابیں جیسے سیرت مہدی خصائص مہدی۔ انوار العیون وغیرہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ بعد میں جو حالات پیش آئے اور جو عظیم تغیر اس فرقہ میں مکران آکر واقع ہوا ان کی تفصیل کسی مطبوعہ کتاب میں نہیں مل سکتی۔ البتہ چند قلمی کتابیں فرقہ ذکریہ کے پیشواؤں کے پاس ہیں، لیکن از قرار شنیدانی میں قابل اعتراض مواد ہونے کی وجہ سے یہ ان کتابوں کو طبع کرنے اور دکھانے کے لئے رضامند نہیں ہیں۔ یہاں ان روایات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جو پشتوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔

مہدویہ سے ذکریہ تک | سید محمد جونپوری کی وفات کے بعد مریدین تتر بتر ہو گئے۔ بعض نے واپس ہندوستان کا رخ کیا اور بعض دیگر علاقوں میں بکھر گئے۔ انہیں مریدین میں سے ایک ملا محمد نامی اٹک کا رہنے والا تھا۔ گھومتے پھرتے سرباز جو فی الحال ایران بلوچستان میں شامل ہے۔ جا نکلا۔ اُس وقت سرباز، کیچ، پنجگور، اور وزک وغیرہ بلوچستان کے علاقوں میں بلیدئی خاندان کی حکومت تھی، اتفاق سے ایران میں فرقہ باطنیہ، (اسماعیلیہ کی ایک شاخ) اسماعیل شاہ صفوی شاہ ایران کے زیر عتاب آچکا تھا۔ اسی فرقہ کے کچھ لوگ سرباز آ چکے تھے یہ اپنے آپ کو سید ظاہر کرتے تھے۔ سرباز پہنچ کر ملا محمد موصوف نے باطنیہ کے پیشواؤں سے گفت وشنید کی۔ دونوں فرقوں میں عقیدہ مہدی، باطن پرستی اور فلسفۂ وحدۃ الوجود بطور اقدار مشترکہ موجود تھے۔ کچھ مہدوی عقائد اور کچھ باطنی خیالات کا ملاپ ہوا۔ دونوں کے سنجوگ سے ایک تیسرے فرقہ "ذکری" نے جنم لیا۔ اس کا بانی ملا محمد اٹکی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ صاحب الہام ہے، اور مہدی آخر الزمان کا جانشین ہے۔ شرع محمدی کو امام مہدی نے منسوخ کر دیا ہے۔ نماز، روزہ، حج بیت اللہ وغیرہ عبادات کی فرضیت ختم ہو گئی ہے۔ ان کی فرضیت کا اعتقاد کفر ہے، ان سب کا قائم مقام ذکر ہے۔ باطنی سیدوں سے مل کر اس نے انہیں عقائد کا پرچار شروع کیا۔ سب سے پہلے حاکم سرباز جو فی الحال ایرانی بلوچستان میں ہے کو دعوت دی اور اس نے اجابت بخشی۔ وہاں سے ملا محمد موصوف کو حاکم کیچ کے پاس پہنچایا گیا۔ اس نے بھی دعوت پر لبیک کہی۔ پنجگور کے حاکم نے بھی اُسے قبول کیا۔ تربت اس فرقہ کا مرکز قرار پایا۔ نیز یہاں تربت میں ایک ملا مراد نامی با اثر آدمی اس کے حلقہ ارادت میں آ گیا اور اس نے اس کو اپنا خلیفہ بنا دیا۔ کوہ مراد اسی ملا مراد خلیفہ کی طرف منسوب ہے۔ متبرک مقامات کا تعین شروع ہو گیا۔ دو بنر کہوئر، مہبط الہام قرار پایا۔ یہ ایک درخت ہے۔ جو تربت بازار سے مغرب کی جانب ہے۔ حج کیلئے کوہ مراد کو مقرر کیا گیا۔ جو تربت سے جنوبی جانب ایک پہاڑی ہے۔ عرفات کیلئے "گل ہ ڈن" کو تجویز کیا گیا۔ جو تربت سے جنوباً ایک میدان ہے۔ زم زم کی جگہ "کاریز ہرّئی" نے لی جو تربت کی ایک کاریز تھی۔ اور اب خشک ہو گئی ہے۔ کوہ امام[1] غار حرا بنا یہ کوہ مراد سے مغربی جانب ایک دوسری پہاڑی ہے۔

پھر یہیں سے ملا محمد موصوف پوشیدہ طور پر سندھ سے ہوتا ہوا ہندوستان چلا گیا۔ ادھر سے مریدوں نے مشہور کر دیا کہ "نوری بود بعالم بالا رفت" یعنی نور تھا اور آسمانوں میں چلا گیا۔

رہبانیت کی طرف میلان | اُس وقت کے تصوف پر وحدۃ الوجود کا غلبہ تھا۔ اور خود سید محمد جونپوری وحدۃ الوجودی تھا۔ باطنیہ اس فلسفہ کو کھینچتے کھینچتے رہبانیت تک اس کی حدیں ملا چکے تھے۔ ملا محمد اٹکی نے بھی

[1] امام سے یہاں مراد ملا محمد اٹکی ہے اور یہ ان کی طرف منسوب ہے۔

اس کو باطنیہ کی شکل میں قبول کر لیا اور بتایا جاتا ہے کہ پیشوایان فرقہ ذکریہ کے پاس ایسے قلمی نسخے موجود ہیں جن میں نکاح و طلاق و محرم و غیر محرم کی تمیز کو درمیان سے اڑا دیا گیا ہے۔ یہی موانع ہیں جو اُن کی کتابوں کو طبع ہونے یا شائع ہونے سے روکتی ہیں۔ البتہ بلوچی روایات و تہذیب نے ان خیالات کو منضبط نظریات کی حد تک محدود رکھا ہے۔ اور فی زمانہ عملی شکل میں ان کو آنے نہیں دیا ہے۔

فرقہ ذکریہ کے بعض عقائد ا۔ ان کے نزدیک سید محمد جونپوری نبی آخر زمان ہے اور عام عقیدے کے مطابق وہ نور ہے۔ مرا نہیں ہے۔ لیکن اللہ کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔

۲۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ انبیاء علیہم السلام ایک نبی ہیں۔ اس پر اجمالی ایمان ضروری ہے۔ البتہ خاتم النبیین سید محمد جونپوری ہے۔

۳۔ قرآن مجید دراصل سید محمد جونپوری پر نازل ہوئی ہے۔ البتہ بواسطہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوئی ہے۔ لہذا اس کی وہی تعبیر و تفسیر معتبر ہے۔ جو سید محمد جونپوری سے بواسطہ محمد اٹکی منقول ہے۔ وہ صحیح نہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔

۴۔ نماز، روزہ، حج بیت اللہ وغیرہ عبادات کی فرصت ختم ہوگئی ہے۔

۵۔ سید محمد جونپوری ناسخ شرع محمدی ہے۔

۶۔ کوہ مراد حج کا قائمقام ہے۔

۷۔ قرآن مجید میں جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے۔ یا جو آیات اُن سے متعلق ہیں۔ ان سے مراد سید محمد جونپوری ہے وغیرہ ان عقائد میں یہ فرقہ مہدویہ سے یکسر مختلف فرقہ ہے۔ اور مہدویہ ان کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں۔

مہدویہ اور ذکریہ کے عقائد کا مقابلہ اور فرق ا۔ مہدویہ کے نزدیک سید محمد جونپوری مہدی منتظر تھا۔ اور ذکریہ کے نزدیک نبی آخر الزمان۔ لہذا مہدویہ کے نزدیک لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے۔ اور ذکریہ کے نزدیک لاالٰہ الا اللہ نور پاک نور محمد مہدی رسول اللہ ہے۔

۲۔ مہدویہ کے نزدیک سید محمد جونپوری فراہ میں وفات پا گیا۔ اور ذکریہ کے عام عقیدے کی رو سے وہ نور ہے۔ مرا نہیں ہے۔

۳۔ مہدویہ کے نزدیک محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والرسل ہیں۔ سید محمد جونپوری مہدی اور خلیفہ رسول تھے۔ ذکریہ کے نزدیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ انبیاء ایک نبی ہیں۔

۴۔ مہدویہ کے نزدیک قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اور اسکی وہی تعبیر و تفسیر

صحیح ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے۔ ذکریہ کے نزدیک یہ کتاب سید محمد جونپوری کیلئے نازل ہوئی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو درمیان میں ورطہ بنایا گیا ہے۔ اور اس کی وہی تعبیر و تفسیر معتبر ہے۔ جو روایت ملا محمد اٹکی سید محمد سے منقول ہو۔

۵۔ مہدویہ کے نزدیک آیات قرآنی میں جہاں محمدؐ کا ذکر ہے۔ اس کی مراد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور ذکریہ کے نزدیک سید محمد جونپوری مراد ہے۔

۶۔ مہدویہ کے نزدیک نماز و روزہ و حج بیت اللہ اور دیگر عبادات و فرائض کی فرضیت بدستور قائم ہے۔ اور انکار کفر ہے۔ ذکریہ کے نزدیک یہ تمام منسوخ ہو گئے ہیں۔ اور ان کی فرضیت پہ اعتقاد رکھنا کفر ہے۔ لہذا مہدویہ ان عبادات کے پابند ہیں اور ذکریہ ان سے بیزار ہیں۔

۷۔ حج کوہ مراد اور اس کے توابع کا مہدویہ کو کوئی علم نہیں اور ذکریہ کے نزدیک یہ بیت اللہ کا قائمقام ہے۔

علاوہ ازیں آگے چل کر ذکریہ کے جن عبادات مخصوصہ کا مختصر ذکر آئے گا ان میں بھی مہدویہ سے یہ فرقہ یکسر مختلف ہے۔

ذکریہ کا طریقہ عبادت جیساکہ ماقبل میں گذر گیا۔ عبادات اسلامیہ اس فرقہ کے نزدیک منسوخ سمجھے جاتے ہیں، پھر انہوں نے عبادت یا بقول اُن کے، طاعت کی چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ سجدہ :- اس کیلئے ایک وقت تو صبح صادق سے ذرا پہلے کا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ زن و مرد یکجا ہو کر باآواز بلند چند کلمات خوش الحانی سے پڑھتے ہیں۔ اور پھر بلا قیام و رکوع ایک طویل سجدہ کرتے ہیں اس میں کچھ اوراد پڑھتے ہیں۔ سجدہ کیلئے کسی سمت کی طرف رخ کرنا متعین نہیں۔ بلکہ گول دائرے کی شکل میں رو برو ہو کر سجدے میں گرتے ہیں۔ یہ ایک طویل سجدہ ہوتا ہے۔ دو دیگر سجدے انفرادی ہوتے ہیں۔

۲۔ چوگان :- اس کے لئے کوئی وقت یا مقام مقرر نہیں۔ بلکہ جب جی چاہے اور کافی لوگ جمع ہوں۔ اس وقت وہ اسے کرتے ہیں۔ یہ ایک فرضی عبادت نہیں بلکہ نفلی حیثیت رکھتی ہے۔ سال میں سب سے بڑا چوگان یا بقول بعض "کشتی" ستائیس[۲] رمضان کی رات کو ہوتا ہے۔ یا ذوالحج کی دس تاریخ کی رات۔ صورت اس کی یہ ہے کہ لوگ حلقہ بنا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خوش آواز عورت درمیان میں کھڑی ہو کر بلوچی زبان میں کچھ اشعار یا رجزیہ جملے خوش الحانی سے کہتی ہے۔ اور ارد گرد کے لوگ رقص کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ دو۔ دو تین۔ تین گھنٹے تک یا پوری رات یہ جاری رہتا ہے۔

۳۔ ذی الحجہ کی پہلی تہائی میں روزہ رکھتے ہیں۔

ایک دوپہر کو اور ایک غروب آفتاب کے وقت یہاں سے آفتاب پرستوں سے ان کا کوئی اعتقادی تعلق ثابت ہوتا۔

۴۔ ستائیس رمضان ان کے حج کی تاریخ ہے۔ اور دس ذی الحجہ کو بھی ایک اجتماع کوہ مراد پہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ اس سے کم درجہ رکھتا ہے۔ ادائیگی حج اس طرح ہوتی ہے کہ کوہ مراد کے گرد ستائیس[1] رمضان کو ایک طواف ساتھ مل کر کرتے ہیں۔ وہاں قربانی بھی ہوتی ہے[2] چند اونٹوں کو مسلسل چوگان ہوتا ہے۔

کتب ذکریہ | اس فرقہ کے پاس اپنی کوئی مطبوعہ کتاب موجود نہیں۔ البتہ چند قلمی کتابیں پیشوایان فرقہ کے پاس پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے چار کے نام لئے جاتے ہیں۔ جو فارسی زبان میں ہیں :-

۱۔ سیر جہانی :- یہ کتاب دراصل سید محمد جونپوری کا سفر نامہ یا روزنامچہ ہے۔ جو مختلف طریقہ سے منقول چلی آرہی ہے۔ یہ منظوم بھی ہے، اور نثر میں بھی موجود ہے۔

سیر نامہ :- یہ اس فرقہ کے عقائد و خیالات مخصوصہ کا مخزن ہے۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں مل سکتی ہیں جو نا قابل اظہار و اشاعت ہیں۔

۳۔ قاسمی :- یہ کتاب شاید سید قاسمی مہدوی کی انوار العیون کا چربہ ہے۔

نور نامہ :- یہ ایک مسلمان ملا کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ البتہ بعد میں اس فرقہ کے ملاؤں نے کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کے قلمی نسخے بنائے ہیں۔ اور سید محمد جونپوری پر اس کے مندرجات کو منطبق اور چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس فرقہ کی کل عمر بموجب ترتیب تواریخ چار سو اسی سال ہوتی ہے۔ یہ اپنے عقائد و اعمال کی روشنی میں قادیانیوں سے بھی بدتر بہت گیا گزرا فرقہ ہے۔ اور آبادی کے لحاظ سے ایک غیر مسلم اقلیت ہے جو تیس ہزار کی لگ بھگ آبادی پر مشتمل ہے۔

---

[1] قدیم ایام سے حج کی تاریخ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ تھی۔ ۹ ذی الحجہ کو "گل دلمن" میں عرفات مناتے تھے اور دس ذی الحجہ کو طواف کوہ مراد ہوتا تھا۔ قیام پاکستان تک یہی کیفیت تھی۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد ستائیس رمضان کی زیارت شامل ہوگئی اور کوہ مراد زیادہ مشہور ہونے لگا۔ شاید وجہ غیر مسلم قرار پانے سے بچنے کا حیلہ تلاش کرنا تھا۔

[2] قربانی میں گائے، بھیڑ بکریاں ذبح ہوتی ہیں اور دسویں ذی الحجہ کو اس کثرت سے قربانی ہوتی ہے۔ کہ بجا طور پر ان کے "منیٰ" کا پورا حق ادا ہوتا ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ جس مہدی پر سالہا سال ذکری لوگ کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ اس مہدی کا نام تک قرآن پاک میں نہیں ہے۔

جناب عبدالحفیظ صاحب۔ راولپنڈی

جنگِ آزادی کس نے لڑی؟

ہم "مسلح خونی انقلاب" کی وجہ سے آزاد ہوئے

ہماری اس سے بڑی بدقسمتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ہمارے ملک میں برسرِاقتدار مسلم لیگ کی سابقہ حکومتوں نے ہمارے نوجوانوں کو آزادی کے حصول کے لئے دی گئی قربانیوں سے ناآشنا رکھا۔ اُن کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی جاتی رہی، کہ تحریکِ آزادیٔ ہند کی کتاب میں ہماری آزادی کا پہلا ورق ۱۹۴۰ء کے مارچ کی ۲۳ تاریخ کو لاہور کے منٹو پارک میں ہونے والے مسلم لیگ کے اجتماع میں، پاس ہونے والی "قراردادِ لاہور" سے شروع ہوتا ہے۔ اور برِصغیر کی آزادی کی ساری جدوجہد مسلم لیگ کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ اس سلسلے میں لاہور سے شائع ہونے والے ایک معلوماتی سلسلہ وار کتاب میں یہ "انکشاف" بھی تاریخ کے طلباء کے لئے خالی از دلچسپی نہیں کہ:

"بالآخر مسلمانوں نے قائدِاعظم کی قیادت میں اس ملک (یعنی ہندوستان) کو آزاد کرایا
پاکستان بننے کے نتیجے میں انڈیا کو آزادی نصیب ہوئی۔"

یہ درست ہے، اسے جھٹلا کر اس کی صحت سے انکار کوئی نہیں کرسکتا۔ ٹھیک ہے کہ قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی پاکستان بنانے میں گراں قدر خدمات ہیں۔ لیکن قوم کے ذہنوں کو اس "نئی حقیقت" سے روشناس کرانا کہ ہندوستان کے ۶۰ کروڑ عوام کی آزادی کسی ایک شخص کی مرہونِ منت تھی۔ یہ جہاں حقائق کے منافی ہے۔ وہاں اس سے تحریکِ آزادی میں حصہ لینے والی دیگر جماعتوں مثلاً کانگرس، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا، مجلسِ احرار، جمعیت العلمائے ہند، خدائی خدمت گار تحریک اور خاکسار تحریک وغیرہ کی عظیم قربانیاں نوجوان نسل کے نزدیک بے وقعت ہوجاتی ہیں۔ ویسے بھی یہ تاثر دینا کہ ہماری آزادی صرف ایک ہی شخصیت کے مرہونِ منت ہے شمعِ آزادی کے لاکھوں پروانوں، جنہوں نے وطن کی آزادی کی خاطر اپنا تن، من، دھن قربان کردیا، کی عظیم قربانیوں کی توہین کے مترادف ہے۔

حالانکہ دنیا کی دیگر حریت پسند اقوام کی طرح ہماری آزادی کی تحریک بھی خاک اور خون کی وسیع خلیجوں کو پاٹ کر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس سلسلے میں چند ممالک کی تحاریک آزادی کا مطالعہ کرنا، ہمیں اپنی تحریکِ آزادی کے خونیں باب کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ کیونکہ :-

۱۔ ہماری آزادی کی تحریک فرانس کے ان حریت پسندوں کی تحریک سے مختلف نہیں ہے، جنہوں نے ۱۷۸۹ء میں اپنے حقوق کے حصول کیلئے ظلم و استحصال کا بازار گرم کرنے والے نام نہاد "خادمانِ ملت" کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور کروڑوں مظلوم عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے چند عیاش خاندانوں کو عبرت ناک سزا دی۔

۲۔ ہماری آزادی کی تحریک، روس کے ان جانبازوں کی تحریک سے بھی مختلف نہیں ہے جنہوں نے ۱۹۱۷ء میں عظیم لینن کی قیادت میں زارِ روس کی ظالمانہ حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اور اسکی ذلہ خوار فوجوں سے ٹکر لی۔ اور مزدوروں و کسانوں کی پہلی عوامی گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔

۳۔ ہماری آزادی کی تحریک، انڈونیشیا کی اس مسلح جدوجہد سے بھی مختلف نہیں۔ جو ۱۷۹۶ء سے لے کر ۱۹۴۹ء تک ۱۵۳ برس ڈچ سامراج کے خلاف لڑی جاتی رہی۔ اور بالآخر ایشیا کے عظیم مردِ مجاہد عبدالرحیم احمد سوئیکارنو نے انڈونیشی عوام کی غلامی کی زنجیریں کاٹیں۔ اور ہالینڈ کی توسیع پسند سامراجی حکومت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر "ایشیا" کو آزاد کرا دیا۔

۴۔ ہماری آزادی کی تحریک، کوریا کے ان حریت نواز جوانمردوں کی جدوجہد سے بھی مختلف نہیں۔ جن پر جاپانیوں کے بعد امریکی سامراج تین سال تک مسلسل بمباری کرتا رہا۔ وہاں کے کھیتوں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیا۔ وہاں کے کارخانوں کو نیست و نابود کر دیا۔ کوریا کے متعدد شہروں کو زمین بوس کر دیا۔ مگر وہ کم اِل سنگ کی قیادت میں آزادی کی جنگ لڑنے والے سرفروشانِ وطن کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکا۔ سامراج کو وہاں سے دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ اور کوریا آزاد ہو گیا۔

۵۔ ہماری آزادی کی تحریک، الجزائر کے ایک کروڑ بربروں کی خون سے سُرخ جدوجہدِ آزادی سے بھی مختلف نہیں۔ جن کو کچلنے کیلئے دس لاکھ سفید فام یورپی آبادکار، کالے بربروں کے "خدا" بنے ہوئے تھے۔ فارن لیجن کے بیس ہزار مسلح سپاہی ہر وقت سنگین تانے ان کے سروں پر کھڑے رہتے تھے۔ پانچ لاکھ پارا ٹروپرز اپنے ہولناک اسلحے کے ساتھ سمندری اور ہوائی جہازوں سے الجزائر پہنچ کر اپنی کاروائیاں شروع کر چکے تھے۔ مگر بربر سپاہی اس گیت :

"میدانِ جنگ میں مادرِ وطن پکار رہی ہے۔

سنو! اور لبیک کہو
شہیدوں کا پیغام اپنے خون سے لکھ کر
آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر جاؤ
یہ فتح ہم نے اپنے ہاتھ تیرے ہاتھ میں ڈال دیے۔
ہم نے مرنے کی قسم کھائی
تاکہ الجزائر زندہ رہے۔
گواہ رہو! گواہ رہو!! گواہ رہو!!!

ان کی گونج میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ اور بالآخر اپنے عظیم سپہ سالار، محمد بن باللہ کی قیادت میں دس لاکھ شہیدوں کے خون کا نذرانہ دے کر ۱۹۶۲ء میں فرانس سے آزادی حاصل کر لی۔ (یاد رہے کہ یہ وہی محمد بن باللہ ہے جس کو فرانسیسیوں نے مذاکرات کے بہانے بلا کر گرفتار کر لیا۔ اور پیرس کے قید خانے میں ڈال دیا۔ مگر وہ مصر کے مشہور حریت پسند رہنما صدر جمال عبدالناصر کی مدد سے قید خانے کے دروازے توڑ کر قاہرہ پہنچا۔ وہاں ناصر نے اس کا رابطہ روس، چین اور دیگر کیمونسٹ ممالک کے سفارتخانوں سے قائم کرایا۔ جہاں سے الجزائر کے انقلابی سپاہیوں کو اسلحہ ملتا رہا۔ اور اسی کیمونسٹ اسلحہ سے الجزائری حریت پسندوں نے استعمار کے دانت کھٹے کر دئے۔)

۶۔ اسی طرح ہماری آزادی کی تحریک عظیم انقلابی ماؤزے تنگ کے چین کی سرخ فوج کی تحریک آزادی سے بھی مختلف نہیں جس میں سامراج کے پٹھو چیانگ کائی شیک اور اس کے حواریوں کو زبردست ذلالت کے ساتھ راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

۷۔ اسی طرح ہماری آزادی کی تحریک، ویت نام اور کمبوڈیا کے جانباز مجاہدوں کی جدوجہد سے بھی مختلف نہیں۔ جنہوں نے ہوچی منہ اور سہانوک کی قیادت میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا غرور خاک میں ملا دیا۔ اور اُسے شکست فاش سے دوچار کیا۔

۸۔ مزید برآں ہماری آزادی کی تحریک، تنظیم آزادی فلسطین، اور جنوبی افریقہ میں سفید فام اقلیت نہیں جو ابھی تک اپنے اوطان کو غیر ملکیوں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے مسلح جدوجہد کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہماری جدوجہد کے اس دلیرانہ اور مجاہدانہ زرّیں باب کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ اور ہند کے اس "خونی انقلاب"

کی بجائے نام نہاد "آئینی جدوجہد" کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے ہماری تاریخ مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سلسلے میں قارئین کرام کی خدمت میں، راقم، آزادی کے اس باب کے چند واقعات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ تو لیجئے ملاحظہ فرمائیے۔

ہماری مسلح جدوجہد کی تاریخ سے آج اس محمد قاسم نانوتوی کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جس سے شاملی کے میدان جنگ میں جانے سے پہلے مجاہدین کی ایک میٹنگ میں کہا جاتا ہے:

"ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں۔ ہم بالکل بے سر و ساماں"

تو وہ مجاہد اسلام اور سرفروش وطن کہتا ہے:

"کیا ہمارے پاس اتنا بھی سامان جنگ نہیں جتنا غزوہ بدر کے مجاہدین کے پاس تھا۔؟"

ہماری جنگ آزادی میں صادق پور کے علماء کے کردار کو بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ جن کے متعلق صاحب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" لکھتے ہیں کہ "(انہوں نے اپنا) دائرہ عمل شمال مغربی علاقے ہی میں محدود نہیں رکھا۔ بلکہ پشاور اور درہ خیبر سے لیکر بہار اور بنگال تک مجاہدین کے خیمے تان دئے" صادق پور کے ایک عالم، مولانا عبداللہ صادق پوری تے تو "تحریک شیخ الہند" کے مصنف کے بقول "چالیس سال تک علم جہاد بلند کئے رکھا۔ اور ان کے دور امارت میں بار بار انگریزی نوجوں کو خاک و خون سے کھیلنا پڑا"

اور انہی مولانا عبداللہ صادق پوری سے نامہ و پیام کے جرم میں ہزاروں محبان وطن گرفتار کر کے عبور دریائے شور کئے گئے۔ ایک عرصہ تک پورے شمالی ہند میں خانہ تلاشیوں اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور یکے بعد دیگرے سازش کے مقدمات چلائے گئے۔ مزید برآں مشہور انگریز مؤرخ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کے قول کے مطابق "شمال مغربی آزاد علاقے میں (علمائے صادق پور کے) قائم (کردہ) مرکز میں بھوکے بنگالیوں کے (انگریزوں پر) حملے ایسے ہوتے گویا بھوکے شکار دار پر جھپٹ رہے ہوں۔"

اسی ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر کے مطابق،

اس دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ جنگی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی۔ اور ۱۸۵۶ء و ۱۸۶۰ء تک ان فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی۔ اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی۔

بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔"

یہی شہرہ آفاق انگریز تاریخ نویس مسٹر ہنٹر انگریزی فوج کی پسپائی اور مجاہدین آزادی کی فتح کے متعلق لکھتا ہے:

"بہرحال جب ہم نے اس مہلک گھاٹی کو چھوڑا تو اس کے چپے چپے پر برطانوی سپاہیوں کی قبریں موجود تھیں۔"

آج ہماری تاریخ اُن لوگوں کو بھی نہیں بھلا سکتی "جنہوں نے (انگریز کے) فوجی دستوں کو شکست دی۔ اس کے افسر قتل کئے۔ توپ خانہ چھینا۔ پھر شاملی کی تحصیل پر حملہ کرکے فوج کو شکست دی۔ سرکاری عمارت تباہ کی۔ سرکاری سامان ضبط کیا۔ سپاہیوں کو مارا۔ اپنی آزاد حکومت کی۔ باغی بادشاہ سے وفاداری کا اظہار کیا۔ عبور دریائے شور سے لیکر توپ دم کئے جانے اور ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا ڈالنے تک کی کونسی سزا تھی۔ جو انگریز کے اس دورِ بے آئین میں انہیں نہیں دی گئی۔"

(بحوالہ شاندار ماضی۔ جلد سوم)

ہماری آزادی کی تاریخ اس محمود الحسن کے ذکر کے بغیر نامکمل رہتی ہے جس کے متعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ کہتے ہیں:

"۱۹۰۷ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ العزیز نے ریشمی خط کی تحریک شروع کی۔ اور ۱۹۱۴ء تک اُسے اس حد تک پہنچا دیا۔ کہ اگر کچھ ملک کے خائن خیانت نہ کرتے تو اُسی وقت ہندوستان آزاد ہو چکا ہوتا۔"

(الجمعیۃ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۴۹ء)

یہی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"تم ہندوستان سے انگریز کی سامراجیت کا جنازہ نکال دو، تو مشرقِ وسطیٰ سے اس کے قدم خود بخود اکھڑ جائیں گے۔ اور ہندوستان کے ساتھ ساتھ مشرقِ وسطیٰ بھی آزاد ہو جائے گا۔"

اور واقعی ہوا بھی یہی، ہندوستان سے انگریز کا بوریا بستر گول ہوا، تو مشرقِ وسطیٰ میں مصر کی مردم خیز سرزمین سے وادیٔ نیل کا ایک عظیم فرزند جمال عبدالناصر کی صورت میں یورپ اور امریکہ پر عذابِ الٰہی بن کر ٹوٹا۔ اور ایشیا اور افریقہ کے کتنے ہی ملکوں سے سفید چمڑی والوں کو نکال باہر کیا۔ اسی ناصر کا انگریز سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس کا یہ فقرہ زبانِ زدِ خاص و عام ہو گیا۔

"اگر سمندر کی تہہ میں دو مچھلیاں بھی آپس میں برسرِ پیکار ہوں۔ تو سمجھو کہ اس میں بھی سیاستِ افرنگ کارفرما ہے۔"

علاوہ ازیں ہماری جنگِ آزادی میں وہ ایام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں مالٹا میں اسیری کے دوران حکیم نصرت حسین صاحب جو کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھی تھے، انتقال فرما گئے۔ اور مالٹا میں ہی دفن ہوئے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کا وقت آیا۔ تو آپ نے ان کی قبر پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انگریز حکام نے چند توی الهیکل فوجی جوانوں کو آپ کے ہمراہ کیا۔ حالانکہ آپ اس وقت بہت لاغر ہو چکے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی آپ ان نوجوانوں سے تیز تیز ان کے آگے آگے چل رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ "حضرت! آپ اس بیماری میں بھی، جبکہ آپ سے چلنا محال ہے۔ تو ان نوجوانوں سے کس طرح آگے آگے چل رہے تھے۔؟" شیخ الہندؒ نے جواباً فرمایا:

"میری غیرت یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ انگریز میرے آگے چلے اور میں اس کے پیچھے۔"

اسی طرح ہماری آزادی کی کتاب کا وہ ورق بھی تو قابلِ مطالعہ ہے، جس میں ایک انگریز افسر جیل میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے پوچھتا ہے۔ کہ "میرے لائق کوئی خدمت۔؟" تو شاہ صاحب نے فرمایا "میرے ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔"

اور وہ ۲۷ لاکھ شہیدانِ وطن بھی تو نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ جن کا ذکر کتاب حریت میں ——— انگریزوں کی طرف سے پھانسی کی عام سزا دینا، کانپور سے لیکر دہلی تک درختوں کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دینا، گوروں کی طرف سے جلادوں کو رشوتیں دے دے کر مجاہدین کی پھانسی کے عمل کو طویل کر کے رقصِ بسمل دیکھنے کی تمنا کرنا، مجاہدین کے جسم گرم تانبے سے داغنا، قیدیوں (مجاہدین) کے جلتے ہوئے گوشت سے بدبو کا نکلنا، مسلمانوں کو سور کی کھال میں سی کر زندہ جلا دینا، توپ سے باندھ کر اڑا دینا، بھوکا رکھ کر اور دم گھونٹ کر شہید کر دینا ——— کے عنوانات سے موجود ہے، اور یہ سب کچھ صرف اور صرف اس لئے کیا جا رہا تھا۔ تاکہ لارڈ رابرٹس کی زبان میں "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی برصغیر پر حکومت کریں گے۔"

اور کیا میرٹھ میں سکوتی کے مقام، مظفر نگر میں شاملی کے میدان، سہارن پور میں رڑکی کے ضلع بلند شہر میں کالے باغ، روہیل کھنڈ میں بریلی، بدایوں، مراد آباد، بجنور اور شاہجہان پور کے مقامات اور آگرہ و کانپور و لکھنؤ میں انگریز سامراج کو پے در پے شکستیں دینے والے آزادی کے دیوانوں اور گمنام

شہیدوں کا ہماری آزادی کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں۔

کیا مذکورہ بالا واقعات اور شخصیات، جنہوں نے عین اُس وقت جب برطانوی اقتدار کا یونین جیک ساری دنیا میں لہراتا تھا اور اس کا سورج مغرب میں غروب نہیں ہوتا تھا۔ آسے ناکوں چنے چبوائے، ہماری جنگِ آزادی کے سلسلے کی ایک کڑی نہیں ہیں۔؟ کیا ہمیں آزادی یوں ہی بیٹھے بٹھائے "آئینی جدوجہد" سے سات سال ہی میں مل گئی ہے؟ کیا آزادی کے ان دیوانوں کی جرأت و ہمت، عزم و استقلال اور وطن سے محبت کا ہماری آزادی میں کوئی حصہ نہیں۔؟ کیا تحریکِ ریشمی رومال نے ہماری آزادی میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔؟ کیا ہمیں جعفر تھانیسری کے کالے پانی میں ایام اسیری یاد نہیں آتے۔؟ کیا آج بھی مری سے چند میل کے فاصلے پر الوبہ کے گرد و نواح میں گورہ فوجیوں کی قبریں ہمیں ہماری جنگِ آزادی کے ایک حیرت انگیز جرأتمندانہ باب سے روشناس نہیں کراتیں۔؟ کیا آزاد علاقہ میں آج بھی ہمارے آزاد بھائیوں کے آزادی سے تمتماتے چہرے ہمیں اوراقِ گم گشتہ پڑھنے پر مجبور نہیں کرتے۔؟ اور کیا سامراج اور اس کے حواریوں کے خلاف کانگریس، جمعیت العلمائے ہند، مجلس احرار، تحریکِ خاکسار اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے سرفروش گوریلیوں کی جنگِ آزادی کسی طرح بھی انقلابِ فرانس، انقلابِ روس، انقلابِ الجزائر، انقلابِ انڈونیشیا، انقلابِ چین، انقلابِ کوریا، انقلابِ ویٹ نام و کمبوڈیا اور آزادیٔ تحریکِ فلسطین اور جنوبی افریقہ کے ریگزاروں میں مقامی غیرت مند مجاہدوں کی سفید فام اقلیت کے خلاف جنگ ــــــ ہماری "مسلح جنگ" سے کم ہے۔؟ اور کیا وطن کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کے بجائے وہ لوگ جنہوں نے حریت پسند مجاہدینِ آزادی کو "بدذات"، "نمک حرام" اور "حرام زادہ" کے بدترین الفاظ سے یاد کیا۔ جو اپنے آپ کو انگریزوں کا "نمک حلال نوکر" کہتے تھے، جو انگریزوں کو "میرے آقا" اور "خدا ان کو سلامت رکھے" کی دعاؤں سے یاد کرتے تھے، وہی غدارانِ قوم و ملت ہماری "آزادی کے ہیرو" رہیں گے۔؟ اور کیا ہم اپنی جنگِ آزادی سے اپنی آنے والی نسلوں کو یونہی لاعلم رکھیں گے جیسے سابقہ حکمرانوں نے کیا۔؟ اب بھی وقت ہے، کیونکہ آنے والا مؤرخ بھی اس قوم کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کرتا جو اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کو بھلا دیتی ہے۔

عتیق الرحمٰن صدیقی ایم-اے

تاریخ آزادی کا ایک نامور مجاھد

حکیم محمد عبد السّلام ہزاروی

(رکن مجلس شوریٰ دار العلوم حقانیہ)

ہر روز کتنے ہی لوگ مرتے ہیں اور مر کر مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتے ہیں۔ مگر کوئی بھی ان کا نام لیوا نہیں ہوتا۔ مگر کچھ لوگ مر کر بھی نہیں مرتے بلکہ انہیں ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے۔ یہ زندگی انسان کی رفعت و عظمت و تمکنت سے عبارت ہوتی ہے، اور انہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو ملک و ملت کی بھلائی میں صرف کیا ہوتا ہے۔ اور اس راہ کی صعوبتوں اور دشواریوں کو صبر و ہمت کے ساتھ برداشت کر کے ایک قابل تقلید مثال کی نیو رکھی ہوتی ہے۔

ہری پور شہر کی ہریالی بستی کے باسی حکیم محمد عبد السلام ایسے ہی عظیم لوگوں میں سے ایک تھے، ان کی ستر سالہ زندگی کا ساتواں حصہ آہنی سلاخوں کے پیچھے گذرا، اس سے نہیں کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا۔ بلکہ اس بنا پر کہ وہ فرنگی سلطنت کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ اور انگریز کے جور و استبداد کے سامنے کبھی بھی جھکنے کے روادار نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ اس لئے آزادی کی نیلم پری کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہونا ضروری ہے۔

مولانا حکیم محمد عبد السلام ہری پور سے تین میل دور ایک گاؤں میر پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولانا محمد دین جیّد عالم دین اور مجاہد صفت بزرگ تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اس لئے تعلیم کے حصول کی خاطر گھر سے باہر نکل کھڑے ہوئے۔ مختلف دینی کتابیں پڑھنے کے بعد علم طب کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۷ء میں مطب کا آغاز کیا، اور اس سال ان کے مطب میں کانگریس کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۲۸ء میں انہیں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ حکیم صاحب مرحوم اپنی متحرک شخصیت کے باعث جلد ہی ممتاز مقام پر فائز نظر آتے وہ سرحد کانگریس کمیٹی کے صدر اور آل انڈیا کانگریس کی مجلس عاملہ کے رکن چن لئے گئے وہ کئی بار گرفتار کئے گئے۔

۱۹۲۹ء میں انہیں اس لئے پابندِ سلاسل کیا گیا کہ انہوں نے سوبھاش چندر بوس کو ملک سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔ چنانچہ انہیں ساڑھے تین سال کے لئے دیولی کیمپ (راجپوتانہ) میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور رہائی کے بعد تین سال تک ہری پور میں پابندِ مسکن رکھا گیا۔

حکیم صاحب نے طبع سلیم پائی تھی۔ اس لئے انہوں نے کچھ عرصہ بعد کانگرس کی پالیسی کے خلاف احتجاجاً استعفیٰ دیدیا۔ اور مجلس احرار اسلام سے منسلک ہو گئے، اور عرصہ تک مجلس احرارِ اسلام کے صوبائی صدر رہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اور ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگی امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ مگر برسرِ اقتدار طبقہ کی گڈ بک میں نہ ہونے کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکے۔

حکیم صاحب ایک زیرک اور فہیم سیاست دان تھے۔ عیاری و مکاری سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا، اس لئے انہوں نے ایسی سیاست سے اپنا دامن بچایا جو مکر و فریب اور سیہ کاری سے عبارت ہو۔ انہوں نے سکوت میں عافیت سمجھی، مگر ان کی حساس طبیعت انہیں کب چین سے رہنے دیتی تھی۔ اس لئے وہ خدمتِ اسلام کی خاطر علمائے حق سے وابستہ رہ کر کام کرتے رہے۔ چنانچہ وفات سے قبل وہ جمعیت علمائے اسلام ہزارہ ڈویژن کے امیر تھے۔ اپنی صداقت و فراست کی بدولت طبی دنیا میں انہیں منفرد مقام حاصل رہا وہ ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ طبی بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے اور ۱۹۶۵ء میں دوبارہ قرعۂ فال ان ہی کے نام پڑا۔ اور حکومت نے انہیں ممبر نامزد کر لیا۔ تیسری بار انہوں نے اطبا کی مقبول جماعت پاکستان طبی کانفرنس کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور تقریباً اٹھارہ ہزار ووٹ لے کر بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے وہ اپنی طبی صلاحیتوں اور جاذبِ نظر شخصیت کی بدولت مرجع خاص و عام رہے۔ دور دور سے لوگ ان کے مطب میں حاضر ہوتے اور فیض حاصل کرتے تھے۔

حکیم صاحب متنوع اور بوقلموں صفات کے حامل تھے۔ سیاسین کے حلقہ میں بالغ نظر سیاستدان کی طرح سیاست کے اسرار و رموز بیان فرماتے۔ علماء کی مجلس میں دینی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے۔ طبیبوں میں تشخیص و تجویز کے مراحل سے گزرتے زمینداروں سے زمین کے مسائل پر ایک زمیندار کی طرح گفتگو کرتے صوفیاء میں سلوک کی منزلیں طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اور عام لوگوں سے ان کے مزاج کے مطابق گفتگو کرتے حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ ان میں اتنی خوبیاں تھیں کہ اپنے بیگانے بڑے چھوٹے امیر و غریب سبھی انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ نہایت ہی پُرشکوہ اور وجیہہ شخصیت کے مالک تھے، ان کے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ بکھری ہوتی تھی، وہ ماتھے

پر جینٹ ڈال کر بات کرنے کے عادی نہ تھے ۔ بلکہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے ۔ ان کے طنز میں لطیف سی چبھن ہوتی ۔ اور ظرافت میں مزے کی چاشنی، وہ بات سے بات پیدا کر لیتے ۔ وہ دوستوں کے دوست تو تھے ۔ مگر دشمنوں کے بھی دوست تھے ۔ وہ اپنے مخالف کو جانتے ہوئے بھی اس کا احترام کرتے اور کسی کی یاوہ گوئی کو خاطر میں نہ لاتے ۔ وہ دستر خوان کشادہ رکھتے تھے ۔ یہاں تک کہ اکیلے دستر خوان پہ بیٹھنے کے عادی نہ تھے ۔ سیاسی لیڈروں کی آمد ہوتی یا علماء کی مجلسیں ہوتیں سبھی لوگ حکیم صاحب کے دولت کدہ پہ جمع ہوتے ۔

حکیم صاحب صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے ۔ ان کا یہ معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھتے ۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک تسبیح پڑھنے میں مصروف رہتے وہ باقاعدگی سے قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے ۔ اور مختلف تفاسیر زیرِ مطالعہ رکھتے تھے ۔ گھر کے کام کاج کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے ، وہ دن بھر مطب میں رہتے اور شام کو دکان بند کر کے گھر آجاتے تھے ۔ سونے سے پہلے اخبارات و رسائل اور کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتے تھے ۔ وہ بزرگوں کا بہت احترام کرتے تھے ۔ اور چھوٹوں سے شفقت و پیار سے پیش آتے تھے ۔ وہ اپنے کردار کی بلندی اور بے داغ سیاسی ماضی کی بدولت حکمرانوں کے ہاں بھی احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے ۔ مگر حکیم صاحب اپنی ذات اور اپنے خاندان کیلئے کوئی فائدہ حاصل کرنے کے روادار نہ تھے ۔ اور خودی کی میں مصطفائی کے متلاشی تھے ۔ خوشامد اور کاسہ لیسی سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا ۔ وہ عزتِ نفس کے محافظ تھے ۔ اور آخری دم تک بہ تمام وکمال انہوں نے عزتِ نفس کی پاسبانی کی ۔ وہ اپنے نظریات اور افکار و خیالات میں نہایت پختہ تھے ۔ اور کبھی کوئی مال جاہ انہیں اپنے نظریات سے سرکا نہ سکتا تھا ، اور نہ کبھی اقتدار کا جبروت انہیں مصلحت کوش بنانے میں کامیاب ہو سکا ۔ وہ ایسے قلندر تھے جن کا سرمایہ بجز و لا اِلٰہ کچھ بھی نہ تھا ۔ ان کے مطب میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی ، اور یہ جسمانی مریضوں کا ہی دارالشفاء نہ تھا ۔ بلکہ سیاسی مریضوں کے لئے بھی عافیت کدہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔ بیسویں صدی کے متعدد عظیم علماء اور سیاسی رہنما ہری پور تشریف لائے اور انہیں حکیم صاحب کے دارالشفاء میں چین نصیب ہوا ۔

عید الاضحیٰ کے دوسرے روز حکیم صاحب کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ صاحبِ فراش ہو گئے ۔ دوائیں دی جاتی رہیں ۔ مگر حکیم صاحب کی طبیعت بگڑتی چلی گئی اور ۲۲ جنوری کو رات گیارہ بجے انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ۔ حکیم صاحب کی وفات کی خبر سے فضا میں ایک سکتہ طاری ہو گیا ۔ ہری پور کی تمام بستی افسردہ اور غمگین ہو گئی ، چہرے اداس ہو گئے ۔ طبیعتیں مضمحل اور آنکھیں اشکبار ، آنکھیں رندھی ہوئی تھیں اور آہوں کا ایک دھواں تھا جس سے فضا رچی بسی تھی ۔ اور حکیم صاحب کا چہرہ تھا کہ ایمان کے نور سے جگمگا رہا تھا ۔ اسی عالم میں ایک جسدِ خاکی کو دفن کر دیا گیا ۔ اور برصغیر کی جدوجہد آزادی کا ایک چلتا پھرتا باب کتابِ برزخ سے جوڑ دیا گیا ۔ ع — خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را ❊❊

جناب مضطر عباسی ایم اے۔ مری

مسلسل

جدید زبانوں کے عربی ماخذ

وزیر :۔۔۔ وزیر عربی لفظ ہے۔ اس کی جمع وزراء ہے۔ اہل یورپ انگریزی میں MINISTER فرانسیسی میں MINISTRE ہسپانوی، پرتگالی اور اطالوی میں MINISTRO جرمن میں MINISTER اور روسی میں MINSTR کے کلمات استعمال کرتے ہیں۔ اسپرانتو میں MINISTRO ہے۔ لاطینی میں وزیر کیلئے MINISTER ہے۔ اور ان سب کو لاطینی کے کلمہ MIN سے ماخوذ خیال کیا جاتا ہے، لاطینی میں MIN کے معنیٰ ہیں چھوٹا۔ کم۔ تھوڑا (SMALL) چونکہ وزیر بادشاہ سے کم اور چھوٹے درجے پر ہوتا ہے اس لئے اسے منسٹر (MINISTER) کہتے ہیں۔

دقیق :۔۔۔ دقیق جس سے دقیقہ اور مدقوق کے کلمات، ہمارے ہاں رائج ہیں عربی کلمہ ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں، بہت چھوٹا ذرا۔ مادے کا چھوٹا ذرہ دقیق ہے۔ اناج کو کوٹ کر باریک اور چھوٹے چھوٹے ذرّوں میں تبدیل کر کے آٹا بنا لیا جاتا ہے۔ اس لئے آٹے کو دقیق کہتے ہیں۔ باریک۔ اور چھوٹی چیز کے دیکھنے اور سمجھنے میں دقت اور مشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے "مشکل" کیلئے بھی دقیق اور اَدَق کے کلمات، استعمال ہوتے ہیں۔ وقت کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ یعنی لمحہ اور سیکنڈ دقیقہ کہلاتا ہے۔ عربی کے اس کلمے کے مفہوم کی ادائیگی کیلئے یورپ، کی زبانوں میں حسب ذیل کلمات، استعمال کئے جاتے ہیں۔ انگریزی MINUTE (باریک، خفیف، چھوٹا، منٹ، لمحہ، لحظہ وغیرہ) فرانسیسی اور جرمن میں بھی یہی لفظ ہے۔ یعنی MINUTE ہسپانوی، اطالوی، پرتگالی اور اسپرانتو MINUTO رومانوی (رومانیہ کی زبان) سویڈش (سویڈن کی زبان) اور ڈینش (ڈنمارک کی زبان) میں MINUT ڈچ (ہالینڈ کی زبان) میں MINUUT ہے۔ انڈونیشیا والے MENIT بولتے ہیں۔ رہے ترک اور سواحلی زبان بولنے والے سو وہ ہماری طرح DAKIKA (دقیقہ) استعمال کرتے ہیں۔

کم ازکم :۔۔۔ جس مفہوم اور معنیٰ کیلئے ہمارے ہاں فارسی کا لفظ کم ازکم استعمال کیا جاتا ہے،

اس کے لئے یورپ والے انگریزی میں MINIMUM کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یہ تمام کلمات جو یورپ کی زبانوں کے وزیر (MINISTER) دقیق (MINUTE) اور کم ازکم (MINIMUM) کے ذیل میں اوپر دئے گئے ہیں اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے کلمات بھی ہیں جن کا شمار بیسیوں نہیں سینکڑوں تک پہنچتا ہے ان سب کے بارے میں علمائے لسانیاتِ جدیدہ کا خیال ہے کہ لاطینی کا کلمہ MIN ان کا ماخذ ہے۔

عربی میں مِنْ تبعیض سے تو ہم سب واقف ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ یہ "مِنْ" قلت اور کمی کا مفہوم پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا لفظ مَنّ بھی ہے جس سے مَنّ الشیئی کی ترکیب ہے۔ اور اس کے معنیٰ ہیں کم کرنا۔ مَنّ کاٹ، ڈالنے، ختم کر دینے اور کم کرنے کا معنیٰ بھی دیتا ہے۔ جس سے قرآن کریم میں اجرِ غیر ممنون کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں ختم یا کم نہ ہونے والا اجر۔

انگریزی میں عام استعمال ہونے والے کلمات MINOR (چھوٹا) MINORTY (اقلیت) MINUS (منفی) اور MINUTELY وغیرہ سب کا ماخذ یہی لاطینی کلمہ MIN ہے۔ جو عربی میں مِنْ اور مَنّ دونوں صورتوں میں عربی کے ام الالسنہ ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔

کم :۔۔۔ ایک کم اردو اور فارسی کا "کم" ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں تھوڑا، قلیل، ایک عربی کا "کم" ہے، جس کے معنیٰ ہیں۔ "کتنا" جس سے عربوں نے "کمیت" بنایا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اردو اور فارسی کا "کم" عربی کے "کمیت" والے "کم" سے ایک گونہ تعلق اور واسطہ ضرور رکھتا ہے۔ لیکن ہم جس "کم" کی بات کرنے والے ہیں وہ ہے یورپ والوں کا "کم" جس کا ماخذ لاطینی زبان کا کلمہ COM ہے۔ جو CUM کی صورت میں بھی ملتا ہے۔ یہ سابقہ ہے اور اس کے معنیٰ ہیں "ساتھ" "معہ" TOGETHER اور ALTOGETHER ۔ COMBINE (جمع ہونا، ملنا، اتحاد، اجتماع وغیرہ) اور COMPOUND (مرکب، ملا ہوا، مخلوط وغیرہ) قسم کے بیشمار کلمات کے شروع میں یہی لاطینی کا کلمہ COM بطور سابقہ استعمال ہوا ہے۔ اور CUMULATE (مجموعہ) میں اسکی صورت CUM ہے۔ CONTENT (ضخامت، مضامین کی فہرست وغیرہ) قسم کے بہت سے کلمات میں یہ کلمہ بجائے "کم" یعنی COM یا CUM کے "کن" CON کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مختصر یہ کہ یورپ والوں کے ہاں COM جسکی ایک صورت CUM ہے، اور CON کے کلمات بہت سے کلمات کے شروع میں بطور سابقہ استعمال ہوتے ہیں، اور ان کا مفہوم ہے، ساتھ، معہ، ملحق، ملانا، جوڑنا وغیرہ عربی میں کَمّ اور کَنّ دو لفظ ہیں اور دونوں کے معنوں میں جمع ہونے، ساتھ ہونے ا

مل جانے کا تصوّر قدرِ مشترک ہے۔ پہلے کے معنیٰ ہیں چھپانا، جمع ہونا اور اکٹھا ہونا، اور دوسرے (کَنّ) کے معنیٰ ہیں چھپانا، حفاظت کرنا۔ ساتھ ملانا۔ گویا۔ ن۔ (N) اور ۔م۔ (M) ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی صورت۔ قُنّ۔ اور "کُمّ" میں بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں کے معنیٰ ہیں "آستین" جبکہ ایک جگہ ۔ن۔ (N) ہے، تو دوسری جگہ ۔م۔ (M)۔

قاعدہ :— ن (N) اور ۔م۔ (M) کا ایک، دوسرے سے تبدیل ہونا لسانیات، کا ایک، عام قاعدہ ہے۔ اطالوی اور پرتگالی زبانوں میں چیونٹی کے لئے FORMIGA (فورمیگا) اور اسپرانتو میں FORMIKO (فورمیکو) ہے اور رومانیہ کی زبان، رومانین میں چیونٹی کو FORNICA (فورنیکا) کہتے ہیں۔ یعنی M کی جگہ N استعمال کرتے ہیں۔ انگریز اور فرانسیسی لوگ، خزاں کو AUTUMN (آٹم) کہتے ہیں۔ جبکہ اطالوی اور پرتگالی AUTUNNO اور AUTONO (آٹن اور اُوتونو) کہتے ہیں۔ اسی طرح انگریز اور پرتگالی لوگ، "آرام" کے لئے COMFORT (کم فورٹ) اور فرانسیسی، ہسپانوی، رومانین اور اطالوی زبانیں بولنے والے CONFORT (کن فورٹ) لکھتے اور بولتے ہیں۔ عربی میں اور ہمارے ہاں اردو میں بھی ۔ن۔ ساکن کے بعد ۔ب۔ آجائے تو تلفظ میں ۔ن۔ کی جگہ ۔م۔ آجاتا ہے، جیسے۔ کنبہ۔ کہ اسے ہم سب، "کمبہ" بولتے ہیں۔ اسی طرح "انبار" کو "امبار" "انبساط" کو "امبساط" "انباز" کو "امباز" "انبوہ" کو "امبوہ" اور "انبیا" کو "امبیا" بولتے ہیں۔ ہر جگہ "ن" "م" کی آواز دیتا ہے۔ چونکہ "ن" (N) ۔م۔ (M) سے بدل جاتا ہے۔ اس لئے انگریزی اور فرانسیسیوں نے خزاں کے لئے "آٹم" کا لفظ رکھا تو املا میں۔ ن۔ اور ۔م۔ دونوں لکھ دیئے یعنی AUTUMN اور AUTUMNE۔

کمپنی :— اوپر کی بات چیت سے دو باتیں سامنے آئی ہیں۔ ایک، یہ کہ اہلِ یورپ کا COM (کم) بمعنیٰ ساتھ عربی کا "کُمّ" ہے۔ دوسرے یہ کہ ۔ن۔ (N) اور ۔م۔ (M) آپس میں ایک دوسرے کی جگہ بدل جاتے ہیں۔ آیئے ان دونوں کے حوالے سے اہلِ یورپ کی مختلف زبانوں کے مشترک کلمہ COMPANY (کمپنی) بمعنیٰ "ساتھ" "جماعت" "رفاقت" اور "شراکت" وغیرہ کے ماخذ کی تلاش کریں۔ یہ لفظ ۔AC۔ کے ساتھ بھی مستعمل ہے، یعنی ACCOMPANY اہلِ یورپ کا خیال ہے، کہ AC سابقہ ہے جو علامت مصدر (TO) کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اصل لفظ COMPANY ہی ہے، جو فرانسیسی میں COMPAGNIE ہسپانوی میں COMPANIA پرتگالی میں COMPANHIA اطالوی میں COMPAGNIA اور روسی میں KOMPANYA ہے، اسپرانتو میں، AKOMPANO

اور KOMPANIO دونوں طرح معنیٰ میں معمولی فرق کے ساتھ لکھا اور بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ COMPANY دو کلموں سے مرکب ہے۔ COM (کم) ساتھ۔ معہ۔ اور مشترک وغیرہ اور PANY یا PANIO PAN جو (پان) بمعنیٰ روٹی۔ نان۔ BREAD ہے۔ گویا COMPANY کے معنیٰ ہوئے "مشترک روٹی" کھانے پینے میں ساجھے اور شراکت کی کیفیت، لوگ کمپنی کی صورت میں مل کر روٹی کماتے ہیں۔

اس لفظ کمپنی (COMPANY) کے جزوِ اوّل COM (کُم) کی وضاحت اور ماخذ کی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ رہا دوسرا جزو یعنی PANY یا PANI اور PAN (پان) سو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ لفظ اہلِ یورپ کی تحقیق کے مطابق لاطینی کے کلمہ PANIS سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنیٰ ہیں روٹی۔ فرانسیسی میں روٹی کو PAIN ہسپانوی میں PAN اطالوی میں PANE رومانین میں PIINE اور اسپرانتو میں PANO کہتے ہیں اور ہم برِصغیر کے باشندے بجائے روٹی کے پانی (آب) کو PANI کہتے ہیں۔

غرض PAN کے معنیٰ ہیں روٹی، اہلِ یورپ کی تحقیق کے مطابق اس کا ماخذ لاطینی ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے لاطینی ہی سے یہ لفظ لیا ہو لیکن لاطینی میں کہاں سے آیا اگر اجازت ہو تو اس بارے میں ہم اپنی گذارشات پیش کریں۔ سو عرض ہے کہ۔ ن۔ اور۔ م۔ کے باہم ایک دوسرے سے بدل جانے کا قاعدہ اوپر ملاحظہ کیا جا چکا ہے۔ اس قاعدے کے مطابق PAN (پان) کا۔ ن۔ (N)۔ م۔ (M) کی بدلی ہوئی صورت ہے، یعنی لفظ PAN (پان) نہیں بلکہ PAM ہے۔ انگلینڈ، فرانس، ہسپانیہ، اٹلی، جرمنی اور روس والے بجائے روٹی کے کھجور کے لئے "پام" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، املا میں۔ ل۔ زائد لکھتے ہیں، یعنی PALM لیکن بولتے بھی۔ پام۔ ہیں PAM یا PALM عربی میں فَام ہے۔ جو فُوم کی ایک صورت ہے۔ اور فوم کے معنیٰ ہیں۔ روٹی۔ اناج گندم ہر وہ چیز جس سے روٹی بنائی یا پکائی جا سکے اور فَامَ کے معنیٰ ہیں۔ اس نے روٹی پکائی۔

حاصل کلام یہ کہ "کمپنی COMPANY میں COM عربی کا "کُمّ" ہے اور PAN جو دراصل PAM تھا۔ عربی کا فام اور فوم ہے۔

رہا "پان" یعنی "پام" میں "پ" کا "ف" سے بدلنا سو یہ ایسی واضح اور روشن حقیقت ہے۔ جس پہ گفتگو کے دوران تسلیم کرتے ہیں کہ اینگلو سیکسن اور قدیم ہائی جرمن میں بجائے P "پ" کے F "ف" سے لکھا جاتا تھا۔ یعنی PALM نہیں بلکہ FALM ہے۔

کھجور :— روٹی۔ پان (PAN) کی بات چیت کے دوران PALM (پام) بمعنی کھجور کا ذکر آگیا تھا۔ سو مناسب نظر آتا ہے کہ اس باب میں بھی چند باتیں عرض کر دی جائیں۔ اہل یورپ کی تحقیق یہ ہے کہ PALM (پام) کے اصل معنی کھجور نہیں بلکہ ہتھیلی "کف" اور "ہاتھ" کے ہیں۔ چونکہ کھجور کے درخت کے پتے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح چوڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کھجور کے درخت کو بھی پام (PALM) کہلایا گیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یورپ والوں کو کھجور کے چوڑے چوڑے پتے تو نظر آگئے لیکن پھل کے موٹے موٹے سنہری گچھے اور خوشے نظر نہ آئے عربی میں یہی خوشے فومۃ کہلاتے ہیں۔ "و" حرف علت "ا" سے بدل جاتا ہے، جیسے فوم اور فام یا قول اور قال میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ کھجور کے درخت کو PALM اور قدیم ہائی جرمن اور اینگلو سیکسن میں FALM (پام اور فام) اس کے پتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ خوشوں کی وجہ سے کیا گیا ہے، اور اس کا عربی ماخذ "فومہ" ہے۔

ابجکٹ :— ABJECT حقیر، پست، ذلیل، رسوا، مردود ABJECTION ذلت، خواری، رسوائی وغیرہ OBJECT تردید کرنا، مخالفت کرنا، اعتراض کرنا۔ OBJECTION اعتراض، اختلاف SUBJECT موضوع، بحث، اسی طرح INJECT پچکاری کے ذریعہ دوا جسم میں داخل کرنا، اور REJECT مسترد کرنا، نامنظور کرنا وغیرہ بیشمار کلمات ہیں جو انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں رائج اور مستعمل ہیں۔ مثلاً SUBJECT فرانسیسی میں SUJET ہسپانوی میں SUJETO پرتگالی میں SUJEITO اطالوی میں SOGGETTO اور جرمن میں SUBJEKT نیز اسپرانتو میں SUBJEKTO ہے۔ لغت کی کتابوں میں ایسے کلمات تلاش کئے جائیں تو سینکڑوں کی تعداد میں مل سکتے ہیں، جن میں JECT یا JET یا JEKT وغیرہ کے حروف پائے جاتے ہیں۔ مثلاً پہلا لفظ ABJECT لیجئے اس میں AB سابقہ ہے اور JECT الگ لفظ ہے یہی حال دوسرے کلمات کا ہے۔ ABJECTION میں AB سابقہ اور آخر میں ION لاحقہ ہے۔ باقی اصل مادہ (ROOT) یہی JECT ہے۔ اہل یورپ کی تحقیق کے مطابق JECT کا مادہ اور ماخذ لاطینی زبان کا کلمہ JET ہے، اور وہی جیٹ (JET) جس سے "جیٹ طیارہ" یا جیٹ ہوائی جہاز کے کلمات بنائے ہیں۔ JET لاطینی زبان کا لفظ ہے، اور اس کے معنی ہیں پھینکنا، قوت اور طاقت کیساتھ دور پھینکنا۔ فرانسیسی زبان میں پھینکنا (THROW) کیلئے JETER اور اسپرانتو میں JETI کے کلمات رائج ہیں۔ پہلے لفظ کے آخر ER اور دوسرے کے آخر I (آئی) مصدر کی علامات ہیں۔ اصل مادہ وہی لاطینی کا JET ہے جو عربی میں جھۃ جس سے "جہت" اور "شش جہات" کے کلمات ہمارے ہاں اردو فارسی میں رائج جہۃ یا جہت کے اصل معنی طرف، جانب یا سمت کے ہیں جسکی طرف انسان اپنے آپ کو اپنی توجہ کو یا کسی شے کو پھینکتا ہے۔ اہل یورپ نے "جہت" کی۔ ک۔ کو۔ ی۔ (E) سے بدل کر جیت (JET) بنالیا ہے۔

جناب اختر راہی ایم۔اے
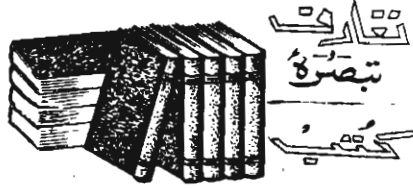
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک | مؤلف : ابوالحسن علی ندوی۔ صفحات : ۲۰۴

ناشر : مجلس نشریات اسلام ۔ ۱۔کے ۔۳۔ ناظم آباد۔ کراچی ۔ ۱۸ طباعت : عمدہ قیمت : ۱۲/ روپے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ عالم اسلام کی جانی پہچانی شخصیت ہیں معروف اقبال شناس ڈاکٹر یوسف حسین کے الفاظ میں "اس زمانے کے علماء کی آبرو ہیں۔" مولانا کے قلم سے کئی بلند پایہ کتابیں نکل چکی ہیں۔ وہ رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے رکن ہیں اور رابطہ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں رابطہ کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے انہیں افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق، اور اردن کا دورہ کرنا پڑا۔

اس دورہ کی رپورٹ زیر نظر سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامہ سے ان ملکوں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور دینی زندگی، ان کے مسائل، وہاں کی فکری، تہذیبی اور نفسیاتی کشمکش پر روشنی پڑتی ہے جس سے قارئین ان ملکوں کے حال و مستقبل کا صحیح ادراک کر سکتے ہیں۔

مولانا بنیادی طور پر مورخ ہیں۔ ان کے رشحات قلم کا غالب حصہ تاریخ ہی سے متعلق ہے۔ وہ خود بھی کہتے ہیں۔

"میرا ذوق تاریخی رہا ہے اور میں اس کے اظہار میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتا۔ کہ تاریخ ہی کے مطالعہ و تحقیق میں میری عمر گزری ہے۔ یہی میرا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔"

موصوف نے زیر نظر سفرنامہ میں بھی تاریخ کی قوتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمان ملکوں کی بیداری کا جائزہ لیا ہے۔ سفرنامہ اگرچہ عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ تاہم عبارت شستہ اور رواں ہے۔ اشعار کے برمحل استعمال سے چاشنی اور رنگینی پیدا کی گئی ہے۔

خطبات مدراس | مؤلف : سید سلیمان ندوی۔ صفحات : ۱۹۴ قیمت : ۱۵/ روپے

ناشر : اظہار سنز۔ ۱۹۔ اردو بازار۔ لاہور۔ طباعت : ونڈ اٹک آفسٹ۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری سے خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نے نہ

صرف اپنے استاد علامہ شبلی نعمانیؒ کی نامکمل "سیرت النبی" کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس موضوع پر رحمتِ عالم اور زیرِ تبصرہ کتاب بھی ترتیب دی۔

مدراس یونیورسٹی میں یہ روایت چلی آرہی تھی کہ ہر سال طلبہ کے سامنے ایک ممتاز مسیحی فاضل حضرت عیسیٰ کی حیات اور مسیحی مذہب کے متعلق چند لیکچرز دیتا تھا۔ مدراس کے صاحبِ دردِ مسلمان سیٹھ ایم جمال محمد کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی اور انہوں نے مسلمان علماء کو مدراس یونیورسٹی میں اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پر لیکچرز دینے کے لئے آمادہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں علامہ ندوی نے سیرت کے موضوع پر آٹھ لیکچرز دیئے اور تین سال بعد علامہ اقبالؒ نے اسلام کے فلسفیانہ پہلوؤں پر خطبات دیئے۔ علامہ ندوی کے یہی لیکچرز "خطباتِ مدراس" کی شکل میں پیشِ نظر ہیں۔

زیرِ تبصرہ مجموعۂ خطبات، سیرت پر بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ کئی بار شائع ہوچکا ہے۔ اظہار سنز نے اب خوبصورت سرورق کے ساتھ آفسٹ کی طباعت سے شائع کیا ہے۔

آئینۂ تربیت (جزو اوّل) | مؤلف : مولانا عبدالحی خلیفہ مجاز حکیم الامت، تھانویؒ۔

ملنے کا پتہ :۔ توحیدی کتب خانہ گل محمد لائن، چاکیواڑہ۔ کراچی ۲۔ قیمت : ۳/۵۰ روپے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف "تربیت السالک" عرفان وسلوک کے موضوع پر ایک عمدہ اور لائقِ مطالعہ کتاب ہے۔ ان کے خلیفۂ مجاز مولانا عبدالحی کا زیرِ نظر کتابچہ "تربیت السالک" کا خلاصہ ہے۔ جو مولانا تھانویؒ کی نظر سے گذر چکا ہے۔ اور ان ہی نے اسے "آئینۂ تربیت" کا نام دیا تھا ۔

کے حق میں فیصلے کا اعلان غالباً ۱۴ مارچ کو گیارہ بجے صبح کی خبروں میں ہوا اور اس کے ساتھ ہی ... میرے کیس مولانا جان محمد عباسی بنام وزیر اعظم بھٹو میں کمیشن نے فیصلہ بھٹو صاحب کے حق میں دیا بعض لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت کے حق میں فیصلہ اسلئے محفوظ رکھا گیا تھا کہ دونوں مقدموں کا ایک ساتھ اعلان ہو اور وزیر اعظم کے حق میں فیصلہ کی تلخی میں وزیر اعلیٰ کے خلاف فیصلہ دینے سے کچھ اعتدال پیدا کیا جائے بہرحال اعلان ہوتے ہی مولانا مدظلہ کے حلقہ انتخاب میں خوشی کی ایک عظیم لہر دوڑ گئی لوگ جشن فتح منانے کے انداز میں حضرت مدظلہ کے مکان پر دوڑ پڑے حضرت نے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے کسی کے خلاف نعروں سے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ ہمیں کبھی غرور نہیں کرنا چاہیئے۔ صحابہ کرام کو اپنی کثرت کا خیال ہوا تو حنین میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے فرمایا کہ کسی کے بارہ میں مردہ باد کا نعرہ ہرگز نہ لگایا جائے۔ اور اس کامیابی پر اللہ کی حمد ادا کی جائے۔ بہرحال پھر الکشن کا معرکہ گرم ہوا حلقہ انتخاب تحصیل نوشہرہ اٹک سے پشاور تک اور شمال میں مردان اور جنوب مشرق میں کیمبلپور جنوب مغرب میں کوہاٹ کے ضلعوں تک پھیلا ہوا ۵ - ۶ سو دیہات اور پہاڑی علاقوں پر مشتمل ایک ایک دن میں جناب ایڈیٹر صاحب اور دیگر حضرات کو دس دس مقامات پر جلسوں سے خطاب کرنا پڑا۔ ۷ مارچ کو الکشن ہوا اور ان بے مثال دھاندلیوں کے باوجود جس نے پورے ملک کو اس عظیم بحران میں ڈال دیا اور ساری مشکلات کے باوجود حق تعالیٰ نے ایک فقیر بے نوا بندہ حق کو وزیر اعلیٰ کے مقابلہ میں نمایاں کامیابی دی اور مولانا مدظلہ نے انچاس ہزار چوبیس یعنی تقریباً ۵۰ ہزار ووٹ (۴۹۰۲۴) حاصل کئے جبکہ کم از کم بیس ہزار حریف نے دھاندلی میں ہضم کئے صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کے بعد تحریک شروع ہوگئی۔ یہاں کی انتظامیہ الکشن میں مار کھا چکی تھی اور وزیر اعلیٰ نصراللہ خٹک سمیت سب کی نظر عتاب مولانا سمیع الحق پر تھی۔ ۱۷ مارچ کی رات کو ان کی گرفتاری کیلئے چھاپہ مارا گیا۔ اس رات اتفاق سے آپ گھر میں نہیں تھے۔ حضرت شیخ الحدیث نے فرمایا میں حاضر ہوں گرفتاری کیلئے۔ پولیس نے معذرت اور ندامت کے ساتھ کہا کہ نہیں مولانا سمیع الحق نہیں ہیں تو متبادل کوئی فرد دیا جائے کہ اوپر سے ہم مجبور ہیں۔ چنانچہ اسی رات مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا انوار الحق مدرس دارالعلوم حقانیہ کو گھر سے گرفتار کر کے نوشہرہ اور پھر چند دن بعد وہاں سے ہری پور جیل منتقل کیا گیا۔ اور دھاندلی کی یہ بھی شرمناک مثال کہ جن کا نام تک پولیس کے پاس نہیں تھا نہ وارنٹ، اسے گرفتار کرنے کے بعد پولیس نے فرد جرم دفتر میں بیٹھ کر مرتب کی۔

اس کے بعد تحریک زور وشور سے چل پڑی۔ اکوڑہ خٹک سے روزانہ جلوس نکلتے رہے۔ اور دارالعلوم حقانیہ کے بہادر طلباء سمیت گاؤں اور مضافات کے لوگ گرفتاریاں دینے لگے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کی دعاؤں کے ساتھ جلوس ان کی مسجد سے روانہ ہوتے۔ پولیس مولانا سمیع الحق کی تاک میں رہی مگر دارالعلوم حقانیہ میں داخل ہونے کی اسے جرأت نہ ہوسکی، بالآخر مولانا سمیع الحق نے ۲۹ مارچ کو ایک جلوس کی شکل میں خود کو گرفتاری کیلئے پیش کر دیا۔ مجھے آپ نے گرفتاری دینے سے بہت روکا مگر مجھے مولانا کی طبیعت کی وجہ سے معلوم تھا کہ انہیں جیل کی اجتماعی اور ہنگامی زندگی میں کتنی دقتیں ہوں گی بالآخر انہوں نے اجازت دیدی رات ہمیں اکوڑہ خٹک کے تھانہ میں رکھا گیا اور ایسے مہمانوں کی طرح کہ صبح تک تھانے کا عملہ ہماری پاسداری میں لگا رہا۔ صبح پولیس نے اپنی گاڑی منگوائی مگر مولانا سے کہا کہ آپ چاہیں تو اپنی موٹر منگوالیں تاکہ آپکو تکلیف

نہ ہو۔ چنانچہ مولانا نے گھر سے موٹر منگوائی ان کے برادر محترم پروفیسر محمود الحق حقانی پشاور یونیورسٹی ڈرائیونگ کرتے رہے۔ پولیس کی دوسری گاڑی ساتھ تھی۔ اور ہمیں نوشہرہ کی عدالت میں پیش کرنے کے بعد پشاور سنٹرل جیل اور پھر اسی دن وہاں سے جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ہری پور سنٹرل جیل پہنچا دیا گیا۔ ۳۰ مارچ کے ۳ بجے ظہر ہم جیل میں داخل ہوئے ہم سے پہلے اسی دن اخبارات سے گرفتاری کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ سب بزرگوں نے نہایت خوشی اور گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ہم لوگ جیل کے احاطہ اے بی سی کی بارک نمبر ۹ میں حاضر ہوئے حضرت مفتی صاحب ایڈیٹر صاحب کو دیکھتے ہی نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے آج خواب میں دیکھا تھا اور دعا مانگی تھی کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی ہری پور جیل میں بھیجے آگئے۔ بس اس کے بعد حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی بذلہ لطف، پُر از معلومات مجلسیں بھی اور اہم تھیں۔ ویسے تو تمام اسیروں کے لئے مفتی صاحب مدظلہ کا قیام اور وجود نہایت اطمینان اور بہترین تربیت اور سکون قلب کا باعث رہا۔ مگر جناب ایڈیٹر صاحب سے چونکہ آپ کو خاص تعلق خاطر ہے۔ اور طبیعت کھل جاتی ہے۔ اور لطائف و ظرائف سے مجلس کا رنگ ہی اور ہو جاتا ہے۔ عموماً میں اور ایڈیٹر صاحب دن بھر مفتی صاحب مدظلہ کے ساتھ رہتے درس و تدریس کا بازار بھی گرم ہوا۔ اور بقول مفتی صاحب ہری پور جیل جیل نہیں دارالعلوم بن گیا ہے۔ مفتی صاحب مدظلہ کے صاحبزادے مولوی فضل الرحمٰن متعلم دارالعلوم حقانیہ اور دارالعلوم کے کئی اسیر طالب العلموں نے مفتی صاحب سے مشکوٰۃ شریف ہدایہ اور سراجی کا درس شروع کیا جس میں اور بھی کافی علماء اور زعماء بیٹھتے۔ اس کے بعد دو چار گھنٹے مفتی صاحب ترمذی شریف کی عربی شرح لکھتے۔ ملاقاتیوں کے ہجوم کی وجہ سے بڑی مشکل سے کچھ وقت نکلتا —— مولانا سمیع الحق صاحب کی ہر وقت یہ سعی ہوتی اور جھگڑا جاری رہتا کہ اس کام کے لئے حضرت مفتی صاحب کو زیادہ وقت ملے۔

عصر کے بعد کھلی گراؤنڈ میں حضرت مفتی صاحب نے حدیث کا درس دو ایک دن دیا کہ انتظامیہ نے اس بارہ میں اپنی دشواریاں ظاہر کیں۔ اور درس روک دیا گیا جیل میں ۵-۶ سو تو صرف علماء کی تعداد ہوگی۔ اور مختلف پارٹیوں اور جماعتوں کے بھی لوگ تھے۔ مگر مفتی صاحب مدظلہ کے درس رک جانے کے بعد یہ قرعہ فال مولانا سمیع الحق صاحب کے نام نکلا۔ اور سب کی مرضی سے آپ نے یہ درس شروع کیا جو آج تک باقاعدہ جاری ہے۔ اور نماز عصر کے بعد اے بی سی کی وسیع گراؤنڈ میں ہوتا ہے۔ یہی حال نماز جمعہ کا بھی ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نے جیل میں نماز جمعہ کے جواز کے دلائل کو نہایت واضح طور پر پیش کیا اور جمعہ کا آغاز ہوا۔ حضرت مفتی صاحب جمعہ پڑھاتے اور تقریر بھی جس سے ساری جیل کے سیاسی اور اخلاقی قیدیوں کی عظیم تربیت ہونے لگی۔ اور لوگ متاثر ہونے لگے تین خطبات آپ نے دئے جنہیں ایڈیٹر صاحب نے قلمبند بھی کیا ہے۔ پھر ان کے سہالہ جیل منتقل ہونے پر اب جمعہ پڑھانے کا مسئلہ اٹھا۔ مگر اللہ کی شان کہ یہ سعادت بھی ایڈیٹر صاحب کے ذمہ آئی۔ اور علماء کرام و مشائخ و سیاسی زعماء سب نے بخوشی یہ ذمہ داری آپ کے سپرد کر دی اور آپ جمعہ پڑھانے لگے۔ اور جمعہ سے قبل گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ حالات حاضرہ پر تقریر بھی مدلل طور پر فرماتے ہیں جس سے ہر طبقۂ فکر کے لوگ بڑے خوش ہوتے ہیں۔ دوران اسارت ایک اہم واقعہ مولانا سمیع الحق صاحب اور حاجی فقیر محمد خان صاحب (ایم این اے) کا سابقہ جنرل ٹکا خان حال وزیر دفاع پاکستان کے کہنے پر راولپنڈی جانے کا پیش آیا ۲۴ گھنٹے [illegible] شاہزادہ ڈرامہ کے سلسلہ میں ان حضرات کو حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے سی ایم ایچ ہسپتال راولپنڈی میں ملانے کے سلسلہ میں تھا دلچسپ سفر کی تفصیل یہ ہے۔ (جاری ہے —— شفیق فاروقی)

وضو قائم رکھنے کے لئے جوتے پہننا بہت
ضروری ہے ہر مسلمان کی کوشش
ہونی چاہیئے کہ اس کا وضو قائم رہے۔

سروس انڈسٹریز

پائیدار۔ دلکش۔ موزوں اور
واجبی نرخ پر جوتے بناتی
ہے

• • • •

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

اسلام اور عصر حاضر
تحلیل و تجزیہ ——— جائزہ اور محاسبہ
از مولانا سمیع الحق، مدیر الحق و استاذ دار العلوم حقانیہ
عصر جدید اپنی خدا فراموشی اور فتنہ سامانیوں کی وجہ سے الحاد و مادیت کا دور کہلاتا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن نے اسلام کے نظام عقائد و اخلاق پر یلغار کی۔ مغرب کے استیلاء نے مسلمانوں کے تہذیب و تمدن، اخلاق و معاشرت، سیاست و معیشت کا ہر ہر نقش مٹانے کی کوشش کی۔ دشمنانِ اسلام نے توپ و تفنگ کی بجائے قلم و قرطاس کے اسلحہ سے اسلام پر یلغار کی اخلاق و شرافت سے عاری نظام مادیت نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو پامال کرنا چاہا، مغرب زدہ مٹھی بھر اقلیت حکمران طبقہ نے معروفات کو مٹانے اور منکرات پھیلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا، علماءِ حق اور اہل حق ابتلاء کا شکار ہوئے، عالم اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت بے دین حکمرانوں کے رحم و کرم پر رہ گئی، اسلام دشمن منصوبوں نے علم و تحقیق کے نام پر تجدد و استشراق کا لبادہ پہن لیا مسلمانوں کے ماڈرن طبقہ نے اسلام کو مشقِ تحقیق بنایا، اسلام کے عائلی نظام اور سیاسی خاکوں کو تبدیل کرنے کی سعی کی گئی، بیسویں صدی میں سائنس و انکشاف کی دنیا میں انقلابات آئے مسلمانوں کو نت نئے مسائل اور حوادث سے دوچار ہونا پڑا۔
پیش نظر کتاب میں ان مسائل کا ایمانی جرأت کے ساتھ جارحانہ سامنا کیا گیا ہے۔ مغرب کے نظام اخلاق و معیشت، ظالمانہ اور جابرانہ نظام جہانبانی و سیاست کے سیاہ اور مکروہ چہرہ کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ نقائص پر نکتہ چینی اور مغرب کے پرستاروں کی اندھی تقلید اور غلامانہ ذہنیت پر تنقید کی گئی ہے۔ عالم اسلام اور عالم عرب کو درپیش مسائل اور المیوں کا قرآن و سنت کی روشنی میں تحلیل و تجزیہ اور جائزہ و محاسبہ کیا گیا ہے۔ تجدد و استشراق کا منافقانہ لبادہ تار تار کیا گیا ہے۔ قادیانیت پر بھرپور اور کاری ضربیں لگائی گئی ہیں۔ دشمنان صحابہ اور سبائی ذہنیت پر تنقید کی گئی ہے۔ بہائیت کا احتساب اور دیگر فرق باطلہ اور باطل قوموں کا تعاقب ہے۔ مسلمانوں کے عروج و زوال اور اسباب فتح و شکست پر پر سوز اور موثر گفتگو کی گئی ہے۔ عصر حاضر کے سلاطین جور اور حکام علماء سوء اور بے دین قوتوں پر بلاخوف لومۃ لائم تنقید ہے۔ ہر سطر ہر صفحہ اعلاء کلمۃ حق کا منہ بولتا ثبوت۔
الغرض
معاشرت و معیشت، آئین و سیاست، تہذیب و تمدن، اخلاق و قانون، سائنس و انکشاف، تسخیر کائنات اور زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جس پر مرتب کتاب نے اپنے مخصوص انداز میں روشنی نہ ڈالی ہو۔
صفحات تقریباً ۶۰۰ سائز ۲۲ × ۱۸ قیمت مجلد -/۲۵ روپے۔ کتابت و طباعت عمدہ
آج ہی اپنا آرڈر بک کرائیے
موتمر المصنفین ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک ضلع پشاور
پاکستان